آنگن میں سمندر
لیاقت علی عاصم

# آنگن میں سمندر کا شاعر

آنگن میں سمندر لیاقت علی عاصم کا شاعرانہ انکشاف ہے اس انکشاف کے ذو استعاراتی طلسم خانے میں داخل ہو جائیے اور دیکھنا اور سوچنا شروع کر دیجیے تو آپ پر منکشف ہو گا کہ زندگی اپنی مرکزی حقیقت میں کتنی عجیب اور کتنی حیرت نما ہے۔ آزادی اپنی جگہ کوئی شے نہیں ہے جتنی پابندی آپ اختیار کرتے جاتے ہیں اتنے آپ آزاد ہیں اسی طرح ہر مختاری میں ایک مجبوری اور سکون میں ایک اضطراب کا عمل موجود ہے۔ خواہش و خواب کی دنیا سمندر کی طرح متلاطم اور سیل انگیز ہے بادبان میں اس کے ظرف سے زیادہ ہوا نہیں سما سکتی اور طوفان سے مقابلے کے لئے اتنی ہی حکمت اور قوت درکار ہے جتنا سفر درپیش ہے۔ آنگن کی دنیا بقائے ذات و حیات کے سیل کا سکون ہے۔ لیاقت علی عاصم نے آنگن اور سمندر کی حسن آفریں علامتوں میں انسان اور زندگی کو نئے رخ نئے زاویے اور نئے ذائقے سے تلاش کیا ہے کوئی حقیقت نئی نہیں ہے مگر اضافتِ ذاتی سے حقیقت کا انکشاف ایک نئی حقیقت کا تجربہ ہو جاتا ہے اس طرح زندگی اتنا ہی پھیلاؤ اختیار کرتی چلی جاتی ہے جتنا آپ زندگی میں شریک ہوتے چلے جاتے ہیں زندگی جو قانون رکھتی ہے تخلیقِ شعر اس قانون سے باہر نہیں۔ زندگی ہو کہ شعر، دونوں اپنے جلال و جمال میں اضطراب کا سکون اور سکون کا اضطراب بن جاتے ہیں۔ شاعر کی زبان میں آنگن میں سمندر کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کارِ عشق آزما کرے کوئی ضبط کو ضابطہ کرے کوئی یعنی کارِ عشق آزما شاعر کا سمندر ہے اور ضبط کو ضابطہ بنانے کی خوش سلیقگی شاعر کا آنگن ہے زندگی کا یہ رومان مادّی اور صنعتی سازشوں کے خلاف ایک اعلانِ جنگ بھی ہے اور روح اور مادّے میں توازن کا ایک اشاریہ بھی۔ یہ رومان انسانی رشتوں کی حرمت اور پاسداری کا رومان ہے چاند پر جائیے یا ستارے پر آدمی کا بھلا کرے کوئی اس رومان کا منشور ہے۔ یہ اپنی فطرت میں وقار رکھنے والا رومان ہے اس کے نزدیک دار کا سامنا کرنے میں اتنی ہمت اور قوت نہیں چاہیے جتنی ہمت اور قوت یار کا سامنا کرنے میں درکار ہے یہ رومان اپنے وجود کی بہار میں زندہ رہنے والا رومان ہے۔

کوئی اپنے سوا نہیں موجود اور ہے تو ہوا کرے کوئی۔ اپنے سوا نہیں ہے کوئی ماسوا کا رنگ دیکھا ہے ہم نے آگ جلا کر ہوا کا رنگ اِس رومان میں دوئی نہیں ہے وحدت ہے بس ایک وصال کی جست خیزی ہے جو مسلسل ہے یہ تنہائی وہ تنہائی نہیں جو اردو کے نقادوں کو کھا رہی ہے اس تنہائی میں خواجہ سرائی نہیں کارِ عشق آزما کی کیمیائی ہے جو رشتوں اور رابطوں کو ضبط کے ضابطوں کے ساتھ مسلسل POTENTISE کرنے کے عمل

وہ بھی چُپ تھا میں بھی چُپ تھا عشق میں پہلے پہل
دونوں پر اِک ساتھ گزرا عرصۂ بے چارگی!

لیاقت علی عاصم
آنگن میں سمندر

حقوق : محفوظ بحقِ انیقہ ، عبداللہ شکیب ، ایمن
بتوسط رخسانہ لیاقت

کتاب : آنگن میں سمندر

اشاعت : پہلی بار ، نومبر ۱۹۸۸ء

معاونین اشاعت : مجاہد بریلوی ، شاہد حمید ، عزم بہزاد

طغریٰ : حسن حاجی علی (بھائی جان)

تعداد : گیارہ سو

ضخامت : ایک سو ساٹھ صفحات

قیمت : [illegible] 150/- روپے [illegible]ہ سو

زیرِاہتمام : مکتبۂ ایمن

آر۔ ۵۱۰ سیکٹر۔ ۹ باب الاسلام ٹاؤن
شمالی کراچی۔

اپنے ابّا جی کے نام

جو باقی دُنیا کے باباآجان تھے!

بسترِ مرگ پر تھی اِک دُنیا

اور تم مر گئے کمال کیا

# لہریں

احمد ہمدانی

# سمندر اور آئینہ

لیاقت علی عاصم "رفت کو تسلیم" کرنے اور "رفتار" پر "ایمان" رکھنے کے قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری رویہ میں نہ کوئی حبس اور بے دلی کی کیفیت ہے اور نہ اپنے ماضی پر شرمندگی اور اس سے بے تعلقی کا اعلان ہے، وہ عملِ تخلیق کو معاشرہ سے مربوط ایک مسلسل فعلیت سمجھتے ہیں۔

یورپ والی جذباتی جدیدیت کے باوا آدم "کرکے گور" (KURKE GAARD) نے کہا تھا کہ "انسان کا مسئلہ صرف انسان ہے نہ کہ اس کی تاریخ"۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ کیا تاریخ سے کٹ کر انسان انسان رہ بھی جاتا ہے۔ کیا دنیا میں کہیں کوئی ایک بھی ایسا انسان مل سکتا ہے جسے اس کے معاشرہ سے الگ پہچانا جا سکے اور ظاہر ہے کہ انسانی معاشرہ تاریخی عمل کا ایک مظہر ہوتا ہے چنانچہ انسان کی حقیقت اپنے آخری تجزیہ میں تاریخی حقیقت ٹھہرتی ہے۔

زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے زندگی کی یہ مسلسل حرکت نت نئے تغیرات کو جنم دیتی ہے انسان ان تغیرات کی مطابقت میں خود کو اور اپنے حالات کو بدلتا ہے انسان کے ہاتھوں ایسی تبدیلی کو تاریخ اور تاریخ کا عمل کہتے ہیں۔ حال ہمیشہ ماضی کی کوکھ سے اور مستقبل ہمیشہ حال کے تقاضوں سے جنم لیتا ہے حال میں ماضی کا چہرہ اور مستقبل کی جھلک نہ دیکھنا شعور کی بے بضاعتی اور احساس کی بے مایگی کا نتیجہ ہوتا ہے خوشی کی بات ہے کہ لیاقت علی عاصم کا دامن شعور کی اس بے بضاعتی اور احساس کی اس بے مایگی سے پاک ہے چنانچہ وہ کھل کر اعلان کرتا ہے۔

ع رفت کو تسلیم کر رفتار پر ایمان رکھ

عاصم کی غزلیں رفت اور رفتار کی غزلیں ہیں وہ پرانے مضامین کو نئی جہت اور پرانے استعاروں کو نئے مفاہیم دینے کے ساتھ اپنے معاشرہ اور اپنے حالات سے نئی علامتیں اور نئی تمثیلیں اخذ کرنے میں برابر منہمک رہتے ہیں۔ ان کا یہ انہماک ہی ان کی شاعری ہے۔ مثال کے طور پر احساسِ بیگانگی اور اجنبیت کا مسئلہ ہماری صنعتی تہذیب میں ایک خاص اہمیت حاصل کر گیا ہے آج کا احساسِ بے گانگی روایتی احساسِ بے گانگی سے مختلف چیز ہے احساس کی ان دونوں صورتوں میں فرق کرنے کے لیے اپنی زندگی اور اپنے حالات سے ایک سچے ربط کی ضرورت ہے اور عاصم کے اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس ربط سے عاری نہیں، دو شعر سنیے۔

دل دل کو آنکھ آنکھ کو پہچانتی نہیں      آباد ایک شہر ہے گویا مکان میں

کچھ ایسے ہو گئے ہیں خریدار شہر کے　　　　بکنے لگے ہیں لوگ خود اپنی دوکان میں

ان دونوں اشعار میں "شہر" لغوی نہیں بلکہ تہذیبی معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح مکان اور خریدار بھی صنعتی معاشرہ کی عکاس علامتیں ہیں۔ صنعتی معاشرہ میں بڑے بڑے کارخانے قائم کیے جاتے ہیں جن میں بڑی بڑی مشینیں لگائی جاتی ہیں اور ان میں سینکڑوں کی تعداد میں کارکن ملازم رکھے جاتے ہیں یہ کارکن پیداوار کے الگ الگ مراحل پر کام کرتے ہیں چنانچہ مجموعی طور سے جو چیز تیار ہوتی ہے اسے کوئی بھی کارکن اپنی محنت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتا چنانچہ جو چیز بھی تیار ہوتی ہے اس میں کسی بھی کارکن کی شخصیت کا اظہار نہیں ہوتا اس کے برعکس زرعی نظام میں جب کوئی ہنرمند کوئی چیز تیار کرتا تھا تو اس تیار شدہ چیز میں وہ اپنی شخصیت کی مہر لگی دیکھتا تھا مثلاً اگر کوئی کمہار کوئی خوبصورت برتن بناتا تھا تو وہ تمام تر اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا تھا جس پر اس کی شخصیت کی چھاپ نمایاں نظر آتی تھی چنانچہ اسے اپنے وجود اور اپنی محنت کے درمیان کوئی فاصلہ نظر نہیں آتا تھا لیکن مشینی دور میں کارکن کی محنت اور اس کی محنت سے بنی ہوئی چیز کے درمیان فاصلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کی شخصیت بالکل گم ہو کر رہ گئی ہے اور وہ مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے آج کل کے احساسِ اجنبیت اور احساسِ بے گانگی کا سبب کارکن اور اس کی محنت سے پیدا کردہ چیز کے درمیان یہی فاصلہ ہے۔ محنت کے اس غیر شخصی طریقہ کار کی علامت شہر ہے چنانچہ شہر صرف سڑکوں اور بازاروں کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص پیداواری نظام کی بنیادوں پر استوار ایک اُسلوبِ حیات کا نام ہے ایک ایسے اُسلوبِ حیات کا نام جہاں انسان صرف دوسرے انسانوں کی نظر میں اجنبی نہیں ہو گیا ہے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو گیا اور یہ بے گانگی میر تقی میر کی اس بے گانگی سے بالکل مختلف ہے جو گم شدہ جنت کے خیال سے پیدا ہوئی تھی شہری اور صنعتی تہذیب کی اس وضاحت کے بعد یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں

تعمیر بام و در سے بھی فرصت نہیں مجھے　　　　اور وہ بھی دل کے ساتھ ہے صحرا کہیں جسے

اب وہ تو آئینے سے بھی روپوش ہو گیا　　　　لاؤ کہیں سے ڈھونڈ کے مجھ سا کہیں جسے

جاگتا ہی نہیں کوئی کسی بے خواب کے ساتھ　　　　ایسی راتوں میں تو بہتر ہے سرائے گھر سے

نکل کر حلقۂ اہلِ اثر سے بھاگ جاؤں میں　　　　کئی دن سے یہ خواہش ہے کہ گھر سے بھاگ جاؤں میں

نہ آسماں نہ زمیں گھر دیار کوئی نہیں　　　　مرے سوا مرے کاندھوں پہ بار کوئی نہیں

با دیدۂ تر دل کا ہنر سامنے آیا　　　　کیا پیڑ تھا اور کیسا ثمر سامنے آیا

آئینے ٹوٹیں تو ہم جوڑ دیا کرتے تھے　　　　عکس اب اپنے بگڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

آج کے عہد نے احساسِ بے گانگی کے ساتھ انسانی حسیّت کی مجموعی صورت حال میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً روایتی معاشرہ میں طرزِ احساس کی تشکیل اقدار کے تانے بانے سے کی جاتی تھی لیکن عہد حاضر میں اقدار کی یہ حیثیت ختم ہو گئی ہے اور اب انسان اقدار کی جگہ اپنے تجربہ پر زیادہ بھروسا کرتا ہے اور اپنی حسیّت کی تشکیل اپنے تجربہ کی بنیاد پر کرتا ہے اس

حقیقت کی نشان دہی سب سے پہلے غالب نے اس طرح کی تھی۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

تجربہ کی بنیاد پر تعمیر شدہ حسیت نے روایتی فضلے ایک بالکل مختلف فضا کو ابھارا ہے اس فضا میں روایت کی گونج ضرور ہے لیکن اس گونج میں کچھ نئے سُر بھی شامل ہو گئے ہیں اور یہ نئے سُر ہی ہمارے عہد کی پہچان ہیں۔ عاصم کے چند شعر سُنیئے اور ان نئے سُروں کو پہچانیئے۔

دن بھر رہے جو ساتھ اندھیروں میں کھو گئے — اے دردِ ہجر جاگ کہ سب درد سو گئے

دورِ صبحِ تمنا اور بھی روشن ہوئی — اِک جھلک دکھلا کے تاریکی میں جگنو رہ گیا

ہائے کیسے لوگ تھے عاصم کہ یاد آتے ہیں اب — پھول سب مرجھا گئے ہیں ذکرِ خوشبو رہ گیا

مہ و خورشید بہت شور مچاتے ہیں مگر — نہیں جاتے تری آواز کے سائے گھر سے

ٹوٹ جائے گا کہیں اور چلے جانے سے — یہ جو دیوار کا رشتہ ہے پرائے گھر سے

ابھی رستے میں ہیں کچھ جانے پہچانے ہوئے چہرے — ہراساں ہو کے کیوں گردِ سفر سے بھاگ جاؤں میں

ایسے عالم میں کوئی ساتھ چلے گا کب تک — پاؤں بے سمت ہی پڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

ہر گلِ تازہ سے آتی ہے تمہاری خوشبو — زخم سِل سِل کے اُدھڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

یہ اور ایسے بہت سے اشعار ہیں جو جدید طرزِ احساس کے خدوخال پوری طرح نمایاں کرتے ہیں۔ عاصم جدید طرزِ احساس کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں مگر ان کا رویّہ ہمیشہ مثبت رہتا ہے وہ احساسِ بیگانگی کے سبب زندگی کو یکسر بے معنی اور مہمل نہیں سمجھتے جو جدیدیت کے منفی رویّہ کی خاص پہچان ہے وہ زندگی کے دکھوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان سے شکست کھا کر زندگی سے متنفر نہیں ہو جاتے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں نہ بے معنویت ہوتی ہے اور نہ مریضانہ کیفیت۔

(۲)

لیاقت علی عاصم جدید حسیت کی مکمل ترجمانی کے باوجود منفی رویّہ سے اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں جس کا سبب شاید یہ ہے کہ ان کے ہاں جدید طرزِ احساس مغربی ادبی تحریکوں کا مرہونِ منت نہیں ہے انھوں نے جدیدیت کو اِدھر اُدھر سے اُچکا نہیں بلکہ انھوں نے اپنی روایت میں اس کا سراغ لگایا ہے انھوں نے دیکھا ہے کہ ہماری شاعری میں غالب پہلا شاعر ہے جس نے معاشرتی تبدیلیوں کو روایتی تصورات پر اثر انداز ہوتے ہوئے محسوس کیا اور مروّجہ اقدار کو شکست و ریخت کے عمل سے نڈھال ہوتے دیکھا جس کے نتیجہ میں اس کے طرزِ احساس میں ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ یہ تبدیلی ہماری شاعری میں جدیدیت کا پہلا سنگِ میل ہے۔ عاصم نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے غالب کی لائی ہوئی تبدیلی ہی کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ غالب کی رہنمائی میں اس کا سفرِ تخلیق اجنبی راستوں

کی بھول بھلیّوں کی آفتوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدید تر لہجے اور تازہ تر اظہار کے باوجود نامانوسیّت کا شکار نہیں ہوتا۔ نئی حسیّت نہ اس کے مصرعوں میں جھول پیدا کرتی ہے اور نہ ابہام کی ناقابلِ حل صورت سامنے لاتی ہے۔ احساس میں گُھلے ہوئے مضبوط اور بھرپور مصرعے لکھنا اس کی نمایاں خصوصیّت ہے اور اسے زبان اور بیان دونوں سے انصاف کرنا آتا ہے۔ مثلاً اس کے چند مصرعے دیکھیے۔

ازرہِ بے خبری اپنی خبر کو چلیے
ضبط کو ضابطہ کرے کوئی

مقامِ ہجر پہنچا امیدیں کیا دعائیں کیا
سنگ اب تک سنگ ہے اور آئینہ ہے آئینہ
بدن زمیں کے لئے رُوح آسماں کے لئے
شام کا وقت پرندہ نہ ستارہ نہ چراغ
شام سے سیلابِ گریہ ہے ہماری راہ میں
بستیاں پھر بس گئیں ورنہ بتاتے آپ کو
[illegible] شانہ کش ہے کھینچے نہ سر ہمارا
کسی اور تجھ پہ مقدّم نہیں کیا ہم نے
مکتوب یہ کیسے نگہِ یار سے آئے

یہ چند مصرعے بغیر کسی انتخاب کے لکھ دیئے گئے ہیں ورنہ کم و بیش اس کی تمام غزلیں ہی مضبوط اور بھرپور مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو جدیدیت کے مدعی شعرا میں تقریباً ناپید ہے۔

ہمارے ہاں جدیدیّت کی رٹ لگانے والے بہت سے شعرا کا پورا زور نئی علامتوں اور احساس سے عاری کچھ مستعار تصوّرات پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری بیشتر جدید شاعری یکسانیت کا شکار ہے۔ یہ تمام شاعر فردیّت کے دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن ان کے طرزِ اظہار میں کہیں فردیّت کی چھوٹ تک پڑتی نظر نہیں آتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی شاعری تخلیقی نہیں بلکہ میکانکی عمل ہے تھکا دینے والی تکرار کا عمل۔ ایسی صورت میں لیاقت علی عاصم کی منفرد اور حسّاس آواز ہماری شاعری کے لئے ایک "نیک شگون" ہے۔ اس کے چند شعر سُنیے اور دیکھیے سچے احساس کو تازہ تر اظہار میں کیسے ڈھالا گیا ہے۔

کتنا رویا تھا میں تیری خاطر — اب جو سوچوں تو ہنسی آتی ہے
گھر میں آکر بھی یہ حسرت ہے کہ گھر کو چلیے — وہی آشوبِ مسافت ہے جدھر کو چلیے
سب ستارے پسِ مہتاب چلے جائیں گے — آنکھ رہ جائے گی اور خواب چلے جائیں گے

ہم تجھے دیکھنے بے تاب چلے آتے ہیں
جانے کس کس کو دیکھتے ہو تم
ڈھونڈتے رہنا وصل کا امکاں
سخت دشوار کام ہے عاصم

ہم تجھے دیکھ کے بے تاب چلے جاہیں گے
اس قدر پیاری پیاری آنکھوں سے
ہجر میں بھاری بھاری آنکھوں سے
دیکھنا عمر ساری، آنکھوں سے

کٹ گئے مرے حصّے کہاں کہاں کے لئے
در و دریچہ کے داغ و چراغ اپنی جگہ
چلیے تو اتنی بھیڑ کہ رستا نہیں کوئی
شروعِ عشق میں سمجھے تھے ہم بھی

بدن زمیں کے لئے رُوح آسماں کے لئے
مجھے جلا کے نہ گزری تو شام شام نہیں
سوچیں تو جیسے شہر میں بستا نہیں کوئی
فراغت مل گئی کارِ جہاں سے

مانگے تانگے کے تصوّرات کے بجائے اپنے لہجے میں اپنے احساسات کا اظہار جدیدیّت کی پہلی شرط ہے اور عاصم یہ شرط بدرجہ اتم پوری کرتے ہیں ان کی علامتوں میں سمندر اور آئینہ خاص طور پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے اور شاعر کے احساس و خیالات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں علامتیں ہماری روایتی شاعری میں بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں۔ عاصم نے ان علامتوں کو اپنی روایت سے اخذ کیا ہے لیکن اپنے احساس و تصوّرات کے تناظر میں انھیں نئی معنویّت سے ہمکنار کر کے تازہ کاری کی مثال قائم کی ہے ان کی کچھ غزلیں تو حالاتِ حاضرہ کی سچّی داستانیں ہیں لیکن انھوں نے علامتوں اور تمثیلوں کی مدد سے ان کی وقتی حقیقت کو ہمہ وقتی تاثر کا حامل بنا دیا ہے اور شاید اسی عمل کا نام شاعری ہے۔

ہم پھسلتے جا رہے ہیں عُمر کی ڈھلوان سے
رفت کو تسلیم کر رفتار پر ایماں رکھ

# دشت میں ہو یا گھر میں!

"میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہ اس کو نوکری سمجھ لو خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا صرف شعر کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکّام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مُخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آتے ہیں میری کیا حیثیت تھی غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازہ سے باہر نکل نہیں سکتا، سوار ہونا یا کہیں جانا تو بڑی بات ہے رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آئے۔ شہر میں کون ہے جو آوے گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ، پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔"

"ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط و انبساط بعد چند مدّت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کی ہے۔"

"اور یہ تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔"

---

"مرزا غالب بنام مرزا تفتہ"

کسی بھی فرد کا سیاسی، سماجی اور معاشی شعور اگر تاریخی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے تو عہدِ حاضر کی اصطلاح میں اسے دانشور کہا جاتا ہے، مگر اکثر یہ شعور حساس طبیعت کے باطنی وجود کے بغیر غیر فطری سا لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہی سیاسی، سماجی اور معاشی شعور اگر احساس کی بنیاد پر بیدار ہو جائے تو اک ایسا شاعر ظہور کرتا ہے جس کا شعور کسی بھی عہد میں غیر فطری ثابت نہیں ہو سکتا۔ لیاقت علی عاصم نے سمندر اور ساحل کے درمیان جس شہر میں آنکھ کھولی اُسی شہر میں آج تک ہے وہ بھی غالب کی طرح نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نہیں نکلا وہ اس شہر سے واقف ہے جو روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا جہاں دن گلابی شامیں عنابی اور راتیں شہابی ہوا کرتی تھیں، جہاں چاق و چوبند آہو اور سُبک خرام غزال شہری لغت کو معنی آفرینی فراہم کرتے تھے، جب شام کے آنکھ چراتے ہوئے منظر کے ساتھ ساتھ اُس کے گھر کے قریب ہی کسی دریچے سے اک خورشید نکلتا تھا جب یہ شہر سرِ شام نہیں سو جاتا تھا بلکہ گرمیوں کی شاموں میں کمرے

خالی ہوتے تھے اور آنگن، دہلیز، گلیاں، سڑکیں اور بازار نرم ہوا میں چہل قدمی کرنے والوں سے بھر جاتے تھے جہاں سردیوں کی ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں دیر سے گھر لانے والے راستوں میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا پھر اس کا وہی شہر تھا کہ جس کے گھر کے گھر بے چراغ ہو گئے اور ہوا رات گئے شب خون مارنے لگی، جہاں سکوت بھی باقی رہنے لگا اور ہر اس بھی جہاں روشنیاں تہواروں، چراغوں اور چہروں کے بجائے مکانوں اور سڑکوں کے جلنے سے ہونے لگیں جہاں آباد بستیاں اُجڑ اُجڑ کے بسنے لگیں اور مکینِ شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے لگے

گھر ہم نے بنایا بھی تو اک عمر لگا دی
انفاس کی ترتیب میں ساماں سے زیادہ

شاخیں اُلجھ رہی ہیں سبھی اپنے آپ سے
کیا حال کر دیا ہے ہوا نے درخت کا

اچھا شاعر اپنی شاعری میں زندگی کی اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی روایتوں کی ترجمانی کا دعویٰ کرتا ہے یہ دعویٰ بقا کے راستے میں فنا ہونے پر یقین کئے بغیر ممکن بھی نہیں ہے اور شاعری کے اس جاں کاری اور جاں سپاری سفر میں تن شاعر کا لہو کچھ کم خرچ نہیں ہوتا "آنگن میں سمندر" جہاں استعاراتی سطح پر شاعری کی پُراسراریت اور شاعر کی ہمہ گیریت پر دلالت کرتا ہے وہاں چیزوں، لوگوں، فلسفوں اور نظریوں کے غیر فطری اتصال و ارتباط کے خلاف ایک شاعر کا جذباتی اختلاف اور احتجاج بھی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں گھر میں رہا اور مجھے
ایسا لگتا ہے کہ وحشت میں کہیں گھوم لیا

آلودگی اتنی ہے کہ کھلتا نہیں عاصم
دامن ہے سمندر میں کہ دامن میں سمندر

لیاقت علی عاصم آئینہ گری کی صنعت کو آنکھ سے کم اور دستِ کیمیا گر کی حیرت کو چشم سے زیادہ دیکھنے کا قائل ہے یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کو تلازماتی ترکیبوں میں سوچنے کے بجائے زندگی کو اس کی معنوی حقیقتوں تک برتنا چاہتا ہے اس برتاؤ میں وہ کہیں کہیں اس تناؤ سے بھی گذرا ہے جو جبر و اختیار کی پیہم کشاکش سے عبارت

ہے اور وہ اس سرخوشی سے بھی آشنا ہے جو اپنی ذات اور اس کے کھرے پن کو ثابت کرنے کے لیے منافقانہ اور مروجانہ اصول شکست کرنے کے اقدام سے حاصل ہوتی ہے۔

مِرے خدا یہ مسافت دکان سے گھر تک
کئی کھلونے یونہی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں

مجھے دوراہے پہ لانے والوں نے یہ نہ سوچا
میں چھوڑ دوں گا یہ راستہ بھی وہ راستہ بھی

میرے اپنے نظریہ کے مطابق عاصم بنیادی طور پر لامذہب آدمی ہے آج کل ویسے بھی اگر آپ کسی مہذب آدمی کو مذہبی کہہ دیں تو وہ آپ کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کرے گا۔ مذہب ایک پختہ ارادے کا نام ہے اور آج کل مذہب کے نام پر پختہ ارادے کو ایک لمحے میں کسی بھی ادارے کو حاصل کرنے کے لئے توڑ دینا سیاسی اور معاشی طور پر عین مذہب قرار دیا جا چکا ہے۔

"جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

کائنات میں پیدا ہونے والے ہر اہم آدمی کی طرح جب عاصم نے اپنے انکشافِ ذات کی طرف توجہ کی تو اس کے سامنے اپنی دریافت اور شناخت کے لیے سیاست، صحافت، مذہب اور خدمت کے پیشہ ورانہ شعبوں سمیت کئی معزز پیشے تھے جو نااہل لوگوں سے منسوب ہو کر بے توقیر ہو چکے تھے ایک رات اسی کشمکش، کیف و انجذاب کے عالم میں وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں صورتی طور پر زمین، سمندر اور آسمان ایک تجسیم رکھتے تھے

مجھ کو بھگوان سے کیا کام کہ میں جاتا ہوں
ایک داسی سے ملاقات کو مندر کے قریب

یہ داسی خیال کی داسی تھی اور تخلیقِ کائنات سے پہلے کلِ نُور کو بھی خیال کی اسی داسی سے جدلیاتی طور پر مکاشفہ کرنا پڑا تھا "میں نے سوچا کہ میں جانا جاؤں" عاصم نے بھی سوچا کہ میں جانا جاؤں اور جب وہ وہاں سے پلٹا تو اس کے پاس ایک پیشہ شریف تھا

وہ مرے سامنے آ جائے گا رفتہ رفتہ
مسجد و منبر و محراب چلے جائیں گے

یہی وجہ ہے کہ شعر لکھتے وقت خیال پر اس کی گرفت کبھی کمزور نہیں پڑی وہ اشیاء کو جزوی اور کلّی طور پر سمجھتے ہوئے اپنے اظہار میں بہت شفّاف ہے۔ بنیادی طور پر اس کے موضوعات متنوع اور متحرک ہیں لیکن وہ جامد و ساکت روایتوں کی پاسداری بھی اپنے تخلیقی جوہر کے اضافے سے کرنا جانتا ہے۔ تجربہ انفرادی ہو کہ اجتماعی محویت ذات ہو کہ جدتِ روز و شب اُسکی شعری دسترس خواب گاہ کی زمانی خلوتوں سے عالمِ نگاہ کی مکانی اور امکانی وسعتوں تک بہ یک وقت ہے۔

یہ منظر بہ منظر شہرِ جاں ایک سا ہے
مکاں مختلف ہیں دھواں ایک سا ہے

کچھ بیڑیاں ہیں خالی کچھ پاؤں بے سکت سے
فی الحال کیا بتائیں رُخ ہے کدھر ہمارا

میرے یہ دوش و سینہ و بازو ترے لیے
بستر ہیں بے حساب مری خواب گاہ میں

خواب تعبیر میں ڈھلتے ہیں یہاں سے آگے
آ نکل جائیں شب و وہم و گماں سے آگے

عاصم پچھلی دو دہائیوں سے یہ پیشہ شریف اختیار کیے ہوئے ہیں" آنگن میں سمندر" لیاقت علی عاصم کے اپنے وجود کا ہی نہیں بلکہ ایک پوری جواں سال نسل کے تجربات کا مضبوط ترحوالہ ہے اُردو شاعری کا ہر عہد اپنی جہتی شناخت میں ایک شاعر پیش کرتا ہے آج کا عہد اپنی شناخت میں لیاقت علی عاصم کا پہلا شعری مجموعہ آنگن میں سمندر" پیش کر رہا ہے۔ عہدِ حاضر جن مسائل سے دوچار ہے ان مسائل کو عاصم نے اس طرح اپنی تخلیقی گرفت میں لیا ہے کہ زبان و بیان کیفیت، تاثر اس کے مصرعوں اور غزلوں میں ہم آہنگ ہو کر بھی اپنی ایک الگ جھلک رکھتے ہیں۔ اس کی غزل کا ظاہری رکھ رکھاؤ آنگن کی طرح جتنا پُرسکون ہے باطنی اضطراب اک سمندر کی طرح اسی قدر پُرشور ہے۔

در و دریچہ کے داغ و چراغ اپنی جگہ
مجھے جلا کے نہ گذری تو شام شام نہیں

کچھ تو کم ہو یہ شورشِ دریا
ڈوب جائے خدا کرے کوئی

اس اضطراب کو محسوس کرنا اور اک گہرے مطالعے سے اس کی اہمیت کی تفہیم کرنا اس کے قاری پر فرض ہے۔

رہا سوال لیاقت علی عاصم کا تو اس سے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں

دراڑیں پڑ گئیں چہرے پہ کتنی
کہا تو تھا تمہیں اتنا نہ سوچو

حسین جعفری
۱۰ نومبر ۱۹۹۹

اِس سے بہتر کوئی تصویر مرے پاس نہیں
دیکھ سکتی ہے مجھے میری غزل میں دُنیا

چراغ بھی دسترس سے باہر ہے اور ہَوا بھی
عجیب ہوتا ہے نارسائی کا سلسلہ بھی

یہ گردشوں کے عجیب دن ہیں عجیب راتیں
کہ دل کو دھڑکا ہے ہجر کا بھی وصال کا بھی

مُجھے دوراہے پہ لانے والوں نے یہ نہ سوچا
مَیں چھوڑ دُوں گا یہ راستہ بھی وہ راستہ بھی

گدُاز ہوتا نہیں ہے پانی میں رہ کے پتّھر
ہمارے حلقے میں آکے بدلا نہ وہ ذرا بھی

دُرونِ صحرائے ذات کب سے بھٹک رہی ہے
تری رعُونت کے سائے سائے مری انا بھی

یہ کون مجھ میں سما گیا ہے کہ آج مجھ سے
گریُز کرنے لگی ہیں آنکھیں بھی آئنہ بھی

مجھ بدگمانِ عشق کو معلوم ہی نہ تھا
ہوتا ہے ایک بند تو کھلتے ہیں در کئی

کارِ عشق آزما کرے کوئی
ضبط کو ضابطہ کرے کوئی

چاند پر جائے یا ستارے پر
آدمی کا بھلا کرے کوئی

دار کا سامنا کیا سب نے
یار کا سامنا کرے کوئی

کچھ تو کم ہو یہ شورشِ دریا
ڈوب جائے خدا کرے کوئی

کوئی اپنے سِوا نہیں موجود
اور ہے تو ہُوا کرے کوئی

وصل کے خواب دیکھ لیتا ہُوں
ہجر میں اور کیا کرے کوئی

اپنی خوشبو سے میرے ہوتے ہُوئے
کیوں پریشاں پھرا کرے کوئی

اور مقصودِ آئنہ کیا ہے
خود پہ حیرت کیا کرے کوئی

دوستی ہو کہ دُشمنی، ہم سے
گاہے گاہے مِلا کرے کوئی

عاصم آخر زمیں ہے غالب کی
کِس طرح حق ادا کرے کوئی

بھر لے نہ فلک کو کہیں دامن میں سمندر
ہے چاند کی رفتار سے اُلجھن میں سمندر

خوشبو ہے کہ گرداب ہے گھیرے ہُوئے مجھ کو
یہ رات کی رانی ہے کہ آنگن میں سمندر

اِک اشکِ ندامت پہ ہیں اِترائے ہُوئے سے
ہم جیسے اُٹھا لائے ہوں برتن میں سمندر

اب سَر سے گزرنے میں کوئی دیر ہے باقی
اُلجھا تھا مِرے پاؤں سے بچپن میں سمندر

دِل حالتِ گریہ میں بھر چشم نہ آیا
حیرت ہے کہ بپھرا نہیں ساون میں سمندر

اِس شہر سے کیوں اتنا گریزاں ہے کہ اُڑ کر
جاتا ہے برسنے کے لیے بَن میں سمندر

آلودگی اتنی ہے کہ کھُلتا نہیں عاصم
دامن ہے سمندر میں کہ دامن میں سمندر

ایک ہی موج میں بہا ہُوں مَیں
اور اُس پار جا لگا ہُوں مَیں

نیند آتی ہے یا نہیں آتی
الغرض خواب دیکھتا ہُوں مَیں

خواب میں ہاتھ تھامنے والے
دیکھ بستر سے گر پڑا ہُوں مَیں

دِل میں ایسی شکست وریخت ہے اب
ہر کھلونا خرید تا ہُوں مَیں

کیوں قدم اُٹھ رہے ہیں عجلت میں
کیا بہت پیچھے رہ گیا ہُوں مَیں

اِک طرف دوش اِک طرف فردا
درمیاں سے گزر رہا ہُوں مَیں

مُسافرانِ رہِ آستیں خیال رہے
جو اپنے شہر سے نِکلا خراب و خوار ہُوا

بچھڑ کر رہ گئے ہیں لوگ کیا کیا
اب اتنی دُور آکر سوچنا کیا

گلی سے بھیڑ چھٹتی جا رہی ہے
جو ہونا تھا تماشا ہو چُکا کیا

محبّت اور یک طرفہ محبّت
سمندر میں اکیلے ڈُوبنا کیا

محبّت ہی محبّت کا صِلہ ہے
تو پھر اِس سے زیادہ مانگنا کیا

بہت بے نُور لگتے ہیں ترے بعد
نظر کیا برق کیا دل کیا دیا کیا

کوئی تو ہو سرِ ساحل بھی عاصم
اُبھرنا کیا تمھارا ڈُوبنا کیا

بکھرتی ہُوں کہ خوش نشیں ہُوں مَیں
تا بہ افلاک بے زمیں ہُوں مَیں

خواب تعبیر میں ڈھلتے ہیں یہاں سے آگے
آ نکل جائیں شبِ وہم و گُماں سے آگے

رنگ پیراہنِ خاکی کا بدلنے کے لیے
مُجھ کو جانا ہے ابھی ریگِ رَواں سے آگے

اِک قدم اور سہی شہرِ تنفّس سے اُدھر
اِک سفر اور سہی کوچہ ٔ جاں سے آگے

اُس سفر سے کوئی لوٹا نہیں کِس سے پُوچھیں
کیسی منزل ہے جہانِ گزُراں سے آگے

مَیں بہت تیز ہواؤں کی گزرگاہ میں ہُوں
ایک بستی ہے کہیں میرے مکاں سے آگے

میری آوارگی یُوں ہی تو نہیں ہے عاصم
کوئی خُوشبو ہے مری عمرِ رَواں سے آگے

باہر سے جا مِلا مرے اندر کا انتشار
اپنے خلاف میں نے بھی پتّھر اُٹھالیا

جانے کِس خُودبیں کے ہاتھوں سے گِرا ہے آئینہ
فرشِ شب پر کرچیوں میں بٹ گیا ہے آئینہ

جس نے دیکھا ہو گیا وہ اپنی صُورت کا اسیر
جانے کِس خوش فہم کا سوچا ہُوا ہے آئینہ

خُشک ٹہنی ہو تو صحرا پھُول ہو تو پھُول بَن
جیسی قُربت ویسا ہی قربت نُما ہے آئینہ

دِل میں گھر کرنا پڑے گا آنکھ تک آکر تمھیں
حُسن کی منزل نہیں ہے راستہ ہے آئینہ

آدمی قانونِ فطرت کو بدل سکتا نہیں
سنگ اب تک سنگ ہے اور آئنہ ہے آئنہ

آئنے کی اُس اذیّت ناک خاموشی کے بعد
عُمر بھر مَیں نے نہیں پُوچھا کہ کیا ہے آئنہ

یہاں دستک ہے وہاں گوش بر آواز کوئی
در و دیوار نے مشکل کِیا گھر میں رہنا

صُورتِ موج سمندر میں کہاں سے آیا
مَیں مُسافر کی طرح گھر میں کہاں سے آیا

خواہشِ خود نِگری سبز ہُوئی کِس رُت میں
آئنہ دستِ سکندر میں کہاں سے آیا

سر دریچوں سے نِکل آئے صَدا سُنتے ہی
یہ ہُنر تیرے گداگر میں کہاں سے آیا

مرکزِ گُل تھا سو اَب خاک نظر آتا ہے
یہ تغیّر مرے بستر میں کہاں سے آیا

میری راتیں بھی سیہ دن بھی اندھیرے میرے
رنگ یہ میرے مُقدّر میں کہاں سے آیا

گفتگو کی، ہمیں توفیق نہیں، پچّوں سے
فصل الیسامہ واختر میں کہاں سے آیا

کِس نے کھینچا مری تنہائی کا نقشہ عاصم
دشت اِس شہر کے منظر میں کہاں سے آیا

کسی مکاں کے کھُلے در کا شور سُنتا ہُوں
سکوتِ شب میں سمندر کا شور سُنتا ہُوں

وُہی ہے تُو وُہی آئینے اور مَیں تنہا
تری پناہ میں لشکر کا شور سُنتا ہُوں

کہاں پہنچ کے مُکمّل ہُوئی تری تصویر
تُو چُپ ہے مَیں ترے پیکر کا شور سُنتا ہُوں

اب اتنی بات پہ کیا ترکِ گفتگو اے دوست
کبھی کبھی تو مَیں اندر کا شور سُنتا ہُوں

وہ چشمِ مست اِدھر دیکھ لے تو پھر تا دیر
شکستِ شیشہ و سَاغر کا شور سُنتا ہُوں

عجب مقام ہے دشتِ خیال بھی عاصم
جو گھر بنا نہیں اُس گھر کا شور سُنتا ہُوں

ترتیبِ آب و رنگ و لباس و بدن ہے شرط
آئینہ ہو کے سامنے آئے تو کیا کیا

سوگ میں ہے یا کسی اندیشۂ جانکاہ میں
جو بھی ہے خاموش ہے وہ گھر میں ہو یا راہ میں

بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے آج بھی
شام سے سیلابِ گریہ ہے ہماری راہ میں

دشت میں کیسا سکوں ہے یہ کسے معلوم ہے
سب طنابیں تھام کر بیٹھے ہیں خیمہ گاہ میں

آپ کے ہونٹوں پہ کچھ ہے اور مری آنکھوں میں کچھ
جانے کتنے رنگ ہیں اُڑتی ہُوئی افواہ میں

ایک پیاسے شخص کو سیراب رکھنے کے لیے
سارے لشکر کو اُتارا جا رہا ہے چاہ میں

بستیاں پھر بس گئیں ورنہ بتاتے آپ کو
ہم نے کیا کیا سانحے دیکھے گزشتہ ماہ میں

کچھ ہنسی کچھ آنسوؤں کے درمیاں اُلجھے ہُوئے
تم بھی تو شامل تھے عاصم جشنِ مرگِ شاہ میں

کیا صرف اِسی لیے تھا سارا سفر ہمارا
آدھا شجر تمھارا آدھا شجر ہمارا

اندر سے جیسے کوئی خیمہ اُکھڑ گیا ہو
باہر سے خُوبصورت لگتا ہے گھر ہمارا

دستار چاہتا ہے تلوار مانگتا ہے
ہر ایک ہاتھ اپنا ہر ایک سر ہمارا

کچھ بیڑیاں ہیں خالی کچھ پاؤں بے سکت سے
فی الحال کیا بتائیں رُخ ہے کِدھر ہمارا

جائے کوئی کہاں تک کیا سات آسماں تک
اے گردبادِ ہجرت پیچھا نہ کر ہمارا

سہمی ہُوئی رفاقت پہروں یہ سوچتی ہے
جو ہاتھ شانہ کش ہے کھینچے نہ سر ہمارا

کس کام کا یہ جینا ٹھنڈا پڑا ہے سینہ
آنکھیں لہو سے خالی دل بے بصر ہمارا

کشتِ اُمّید بارور نہ ہُوئی
لاکھ سُورج اُگے سحر نہ ہُوئی

ہم مُسافر تھے دُھوپ کے ہم سے
ناز برداریِ شجر نہ ہُوئی

مُجھ کو افسوس ہے کہ تیری طرف
سب نے دیکھا مری نظر نہ ہُوئی

گھر کی تقسیم کے سِوا اب تک
کوئی تقریب میرے گھر نہ ہُوئی

نام میرا تو تھا سرِ فہرست
اتّفاقاً مُجھے خبر نہ ہُوئی

جانے کیا اپنا حال کر لیتا
خیر گُزری اُسے خبر نہ ہُوئی

تُو نے آنے میں بہت دیر لگا دی اے دوست
اب مرے گھر کا تعلّق نہیں ویرانی سے

آنکھ میں شعلہ تو سینے میں دُھواں رکھّا گیا
خُوب ہے اپنی جگہ جس کو جہاں رکھّا گیا

تشنگی کے غم میں صحرا کو اکیلا چھوڑ کر
شہر کی جانب رُخِ سیلِ رَواں رکھّا گیا

ہم ہَوا نا آشنا لوگوں کو کیا ہوتی خبر
باندھ کر مستُول سے کیوں بادباں رکھّا گیا

اُس میں بھی شامل نہیں تھے کُچھ سفر آمادگاں
نام جس ترتیبِ نو کا کارواں رکھّا گیا

ہر دلِ درد آشنا سے بے دلی برتی گئی
ہر بھڑکتی شمع کے سر پر دُھواں رکھّا گیا

پھر تسلسل سارا شب بھر خیال و خواب کا
پھر مجھے آسودۂ کارِ زیاں رکھّا گیا

ہم تو اِتنا جانتے ہیں سب ہی زندانی ہُوئے
اب یہ اُن سے پُوچھیے کِس کو کہاں رکھّا گیا

شہر میں گھر اُٹھائے پھرتے ہیں
حادثے سر اُٹھائے پھرتے ہیں

مر گئے جس کے دیکھنے والے
ہم وہ محشر اُٹھائے پھرتے ہیں

تیز کیسے چلیں کہ سینے پر
دِل سا پتّھر اُٹھائے پھرتے ہیں

بوجھ اپنا ہے یا پرایا ہے
ہم برابر اُٹھائے پھرتے ہیں

نازکانِ چمن کا حال نہ پُوچھ
خاک پر سَر اُٹھائے پھرتے ہیں

عِشق وہ نازِ زندگی ہے کہ ہم
ہر قدم پر اُٹھائے پھرتے ہیں

آئنہ قتل گاہ ہے دیکھو
عکس خنجر اُٹھائے پھرتے ہیں

اب کِسے معلوم کیا کیا جل گیا
ایک گھر تھا ٹوٹا پھوٹا جل گیا

گھر کی دیواریں ہیں آئینہ بدست
خوبرُو لڑکی کا چہرا جل گیا

شہر والوں نے کبھی پُوچھا نہیں
جل گئی کشتی کہ دریا جل گیا

حسرتیں مُرجھا گئیں اِس بار بھی
آتشِ گُل سے دریچہ جل گیا

اُس طرف کی بھی خبر لیجے کبھی
ابر بتلاتے ہیں صحرا جل گیا

آتشِ نادیدہ ہے یہ، ہجر بھی
یُوں بُجھایہ دل کہ گویا جل گیا

کشتیوں میں آگ لے آئے تھے ہم
اِس لیے عاصم جزیرہ جل گیا

چار جانب سفر میں آگ ہی آگ
ہے ہَوا کے اثر میں آگ ہی آگ

ایک آتش فشاں سے پھیل گئی
دُور تک رہگزُر میں آگ ہی آگ

ایک گھر میں بھڑک اُٹھے شعلے
اور پھر شہر بھر میں آگ ہی آگ

کیا کروں دیکھ دیکھ جلتا ہُوں
اپنے دیوار و در میں آگ ہی آگ

نیند کیسی کہاں کے خواب اے دل
اِن دنوں ہے نظر میں آگ ہی آگ

دیکھ عاصم ہوائے موسمِ سرد
بھر گئی خشک و تر میں آگ ہی آگ

قدم قدم پہ مجھے ٹوکتا ہے روکتا ہے
مَیں اِس حریص کے ہمراہ چل نہیں سکتا

رات کیا عُمر بیت جاتی ہے
حبس میں کس کو نیند آتی ہے

اُن دریچوں سے میری آنکھوں تک
شام کیا کیا دِیے جلاتی ہے

کوئی دیوار بھی نہیں آگے
کیوں صدا جا کے لوٹ آتی ہے

دہنِ غنچہ کھُلتا جاتا ہے
تیری آواز آتی جاتی ہے

صُبح دم کُوچ کا ارادہ ہے
بات کر لو کہ رات جاتی ہے

موجِ یادِ گزُشتگاں عاصم
کِس قدر دُور لے کے جاتی ہے

بکھر کر اِک ستارہ رہ گیا ہے
خلا میں دل ہمارا رہ گیا ہے

بچھڑ کر دُھوپ کی شدّت میں ہم سے
کہیں وہ ابر پارہ رہ گیا ہے

لبوں پر ایک پھیکا سا تبسّم
گئی رُت کا خسارہ رہ گیا ہے

اُجڑ کر رہ گئی ہے رونقِ دل
اُتر کر رُوپ سارا رہ گیا ہے

نہ اب کشتی نہ کشتی کھینے والے
سرِ طوفاں کنارہ رہ گیا ہے

جہاں وہ تھا وہاں اب اپنی خاطر
سفر کا استعارہ رہ گیا ہے

تری دیوار سے بچ کر چلے تھے
جُھلس کر جسم سارا رہ گیا ہے

بدن جیسے رُوئی کا ڈھیر عاصمؔ
یہ دل جیسے شرارہ رہ گیا ہے

تمام دن مَیں کڑی دُھوپ کے سفر میں جلا
ہُوئی جو شام دِیا بن کے اپنے گھر میں جلا

سبھی کے نام لِکھے مَیں نے روشنی کے خطوط
مَیں اپنے گھر میں بُجھا اُن کے بام و در میں جلا

لگا کے آگ نہ سمجھو کہ جل گئی پرواز
یہ کب ہُوا کہ پرندہ کوئی شجر میں جلا

اُس ایک حرفِ تمنّا کی راکھ ہیں آنسو
چراغ سا جو ہواؤں کی رہگزر میں جلا

جلی نہ ہوگی کبھی آگ اِس تسلسل سے
کہ جتنی دیر یہ دل عرصۂ ہُنر میں جلا

کوئی شجر سے تو پُوچھے کہ کس سلیقے سے
میانِ آب و ہوا خواہشِ ثمر میں جلا

قریب و دُور کی سب بستیاں منوّر کیں
یہ ایک دِل جو مرا آتشِ ہُنر میں جلا

کِسی کا ہاتھ مرے ہاتھ میں رہا عاصم
مَیں چاندنی میں نہایا کہ دوپہر میں جلا

ذکرِ چراغِ جاں تھا کہ چلنے لگی ہَوا
پیرایۂ بیاں ہی بدلنے لگی ہَوا

سَر پھوڑتی رہی کہ اندھیرا تھا راہ میں
میرا دِیا جلا تو سنبھلنے لگی ہَوا

جب بھی درخت دُھوپ میں اندر سے بُجھ گئے
دیکھا یہی کہ پُھولنے پھلنے لگی ہَوا

یُوں کتنے بادباں تھے کوئی کشمکش نہ تھی
اِک بادباں کُھلا تو مچلنے لگی ہَوا

وہ میری رُوح بن گیا میں سوچتا رہا
کس طرح آبگینے میں ڈھلنے لگی ہَوا

خوشبو کا اعتراف بھی ممکن نہیں رہا
سانسوں میں ایسا زہر اُگلنے لگی ہَوا

کتنا رویا تھا میں تیری خاطر
اب جو سوچوں تو ہنسی آتی ہے

بہ رسم و راہِ رقیباں گزر رہی ہے حیات
گزُر رہی ہے، مری جاں گزُر رہی ہے حیات

کہیں فِراق مُسلسل کہیں وصال بحال
کہیں کٹھن کہیں آساں گزُر رہی ہے حیات

بھرا ہُوا ہے کہیں آگ سے شکم کا تنوُر
کہیں خِلال بدنداں گزُر رہی ہے حیات

سوادِ رشک و حسد سے لیے، ہُوئے مجُھ کو
مرے گُریز پہ حیراں گزُر رہی ہے حیات

خراش ہے نہ کوئی زخم ہے بدن پہ کہیں
اگرچہ دست و گریباں گزُر رہی ہے حیات

نہ پیرہن پہ نظر ہے نہ کچھُ بدن کا خیال
ہوا کی طرح پریشاں گزُر رہی ہے حیات

تکلّفاتِ نگار و نگاہ کیا کہیئے
عصا بدست نگہباں گزُر رہی ہے حیات

نہ روشنی ہی زیادہ نہ تیرگی کچھُ کم
سرِ ستارہ و مژگاں گزُر رہی ہے حیات

عجیب عالمِ وحشت ہے شہر میں عاصؔم
کئی دنوں سے پسِ جاں گزُر رہی ہے حیات

حصارِ عُمر سے آگے قدم مشکل سے اُٹھتے ہیں
مگر یہ تیرے وابستہ تری محفل سے اُٹھتے ہیں

یہ صحرا راہِ مجنوں ہے سنبھل اے ناقۂ لیلیٰ
بگولے جب بھی اُٹھتے ہیں یہاں محمل سے اُٹھتے ہیں

مجھے بھی جان پیاری ہو گئی جب سے یہ دیکھا ہے
مرے احباب بھی اب حلقۂ قاتل سے اُٹھتے ہیں

تمنّا کے مُسافر بھی غبارِ راہ ہیں گویا
ابھی رستے میں بیٹھے تھے ابھی منزل سے اُٹھتے ہیں

یہ کارِ عشق کی سختی تھکا دیتی ہے انساں کو
جو سو جاتے ہیں اِس عالم میں وہ مشکل سے اُٹھتے ہیں

مقامِ ہجر آ پہنچا اُمیدیں کیا دُعائیں کیا
جنھیں طوفاں ڈبوتا ہے وہ کم ساحل سے اُٹھتے ہیں

یہ کیسا ماتمِ زندہ دلانِ شہر ہے عاصمؔ
نظر چہروں سے ہٹتی ہے نہ ہاتھ اب دل سے اُٹھتے ہیں

بہت بکھرا ہُوا لگتا ہے گھر ترتیب دے لینا
نہیں تو ساز و سامانِ سفر ترتیب دے لینا

ابھی مشکوک ہے موسم ابھی منسوخ ہیں وعدے
اِسی بے چارگی میں بال و پر ترتیب دے لینا

تجسّس اور حیرت کو اگر ہم عکس کرنا ہے
تو خود ہی آئنے کو توڑ کر ترتیب دے لینا

یہی فرُصت کے دن ہیں حلقۂ یاراں بھی ہے موقوف
بہت شامیں گنوائیں اب سحر ترتیب دے لینا

ہر اک چہرہ یہاں کا صبح کے اخبار کے مانند
اور اپنا کام اپنی سی خبر ترتیب دے لینا

بہت آسان لگتا تھا بہت دشوار تر نکلا
کوئی مجموعۂ عیب و ہُنر ترتیب دے لینا

کیا خبر تھی حوصلہ یُوں ہار کر جائے گا تُو
ناؤ جب بن جائے گی دریا سے ڈر جائے گا تُو

پھر وہیں ہے زندگی جانے کہاں تُو رہ گیا
گھر تو آخر بن گیا تسکیں کا پہلو رہ گیا

لوگ آخر رفتہ رفتہ راستے سے ہٹ گئے
حدِّ فاصل مِٹ گئی مَیں رہ گیا تُو رہ گیا

ایک سی رَم خوردگی اور دِل میں اندیشے لیے
مَیں پسِ دیوار اور صحرا میں آہُو رہ گیا

دُور ہی صُبحِ تمنّا اور بھی روشن ہُوئی
اِک جھلک دِکھلا کے تاریکی میں جگنُو رہ گیا

مَیں جو اُس کی یاد میں نِکلا تھا گھر سے تشنہ کام
آسماں سے چاند بھی آ کر لبِ جُو رہ گیا

ہائے کیسے لوگ تھے عاصمؔ کہ یاد آتے ہیں اب
پُھول سب مُرجھا گئے ہیں ذکرِ خوشبو رہ گیا

اکثر اپنے قد و قامت سے بڑی لگتی ہو تم
چھاؤں بھی لگتی ہو تم، دیوار بھی لگتی ہو تم

کتنی سادہ کتنی گُم سُم اپنے ہر انداز میں
شہر کی ہوتے ہوئے بھی گاؤں کی لگتی ہو تم

پاس آ جاتی ہو تو کچھ بھی نظر آتا نہیں
دُور سے آتے ہوئے کیا روشنی لگتی ہو تم

مَیں نہیں تو تم ہی مجھ کو چھُو کے بتلاؤ ذرا
جاگتی آنکھوں مجھے کیوں خواب سی لگتی ہو تم

اس کا مطلب ہے کہ میری موت بھی بن جاؤ گی
میں تمہیں جس رُخ سے دیکھوں زندگی لگتی ہو تم

کتنی غزلیں یاد آجاتی ہیں تم کو دیکھ کر
ہو بہو میری بیاضِ شاعری لگتی ہو تم

ہمارا حال ہمارے مکاں سے اچّھا ہے
خُدا کرے وہ سرِ رہگزر ہی مِل جائے

تم کو دیکھیں تمھاری آنکھوں سے
یہ توقع ہماری آنکھوں سے

آگئی ہے ہماری آنکھوں تک
نیم خوابی تمھاری آنکھوں سے

دِل میں جتنے تھے برف کے تودے
بہہ گئے باری باری آنکھوں سے

جانے کِس کِس کو دیکھتے ہو تم
اِس قدر پیاری پیاری آنکھوں سے

سوچنا دل سے اُس کے بارے میں
دیکھنا کاروباری آنکھوں سے

ڈھونڈتے رہنا وصل کا امکاں
ہجر میں بھاری بھاری آنکھوں سے

سخت دُشوار کام ہے عاصم
دیکھنا عُمر ساری آنکھوں سے

دِل کو آمادۂ فریاد کیا تھا مَیں نے
تُوب آئے ہو تمھیں یاد کیا تھا مَیں نے

پھڑپھڑاتی ہے مِری رُوح بدن میں اب بھی
اِک پرندہ کبھی آزاد کیا تھا مَیں نے

چھوڑ آیا ہُوں سمندر کی نگہبانی میں
وہ جزیرہ جِسے آباد کیا تھا مَیں نے

طِفل کا طفل رہا مکتبِ جاں میں پھر بھی
دہر میں وقت کو اُستاد کیا تھا مَیں نے

شام کا وقت پرندہ نہ ستارہ نہ چراغ
کِس حوالے سے اُسے یاد کیا تھا مَیں نے

دِل میں اِک وہم سا گزرا تھا اچانک عاصم
خُوب آئے، ہوا بھی یاد کیا تھا مَیں نے

جیسا نقشہ تھا ویسا نہیں بن سکا
کیا کہوں گھر کی تعمیر کیسی لگی

قیامتوں سے گزرنا اُسی کو آتا تھا
وہ زندہ شخص تھا مرنا اُسی کو آتا تھا

کبھی جو قرب میں جاگی بدن کی سچّائی
تو اپنے آپ سے ڈرنا اُسی کو آتا تھا

کبھی قریب جو آیا کوئی تو یاد آیا
دل و نظر میں اُترنا اُسی کو آتا تھا

ہزار گردشِ حالاتِ نامساعد میں
مری صدا پہ ٹھہرنا اُسی کو آتا تھا

ہزار چہروں میں وہ مُنتخب نہ تھا عاصم
مگر یہ سچ ہے سنورنا اُسی کو آتا تھا

سب ستارے پسِ مہتاب چلے جائیں گے
آنکھ رہ جائے گی اور خواب چلے جائیں گے

وہ مرے سامنے آجائے گا رفتہ رفتہ
مسجد و منبر و محراب چلے جائیں گے

ہم تجھے دیکھنے بیتاب چلے آئے ہیں
ہم تجھے دیکھ کے بیتاب چلے جائیں گے

سب کہاں آئینہ بناتا ہے
بعض چہرے خدا بناتا ہے

مَیں نے دیکھی ہیں اُس کی تصویریں
عقل سے ماورا بناتا ہے

چُومیے کیوں نہ اُس کے ہاتھوں کو
کیا مٹاتا ہے کیا بناتا ہے

ایک چہرہ سفر میں بعض اوقات
دُور تک سلسلہ بناتا ہے

بھیڑ سے جو نکل گیا عاصم
بس وہی راستہ بناتا ہے

حرف کو لفظ کیا لفظ سے مفہوم لیا
پھر اُسے مَیں نے سرِ نطق و زباں چُوم لیا

اب اُسے کس کے حوالے کروں اے غیرتِ جاں
دستِ معدُوم سے جو تحفۂ موہُوم لیا

لوگ کہتے ہیں کہ مَیں گھر میں رہا اور مجھے
ایسا لگتا ہے کہ وحشت میں کہیں گھُوم لیا

ہدف بنایا تھا اعتراضِ زندگی نے مجھے
مگر بچالیا اندر کے آدمی نے مجھے

وہ آنکھ بند کیے چھو رہا تھا میرا بدن
اِس اہتمام سے دیکھا نہ تھا کسی نے مجھے

جو روشنی میں ترے خدّوخال میں گم تھے
دکھا دیے ہیں وہ سب رنگ تیرگی نے مجھے

بس اتفاق ہی کہیئے کہ دَم اُلجھنے لگا
خُدا بنا ہی دیا تھا مِری خودی نے مجھے

عجب طرح سے ستایا خُدا کے بندوں نے
خُدا بھی یاد نہ آیا کئی مہینے مجھے

وہ اِک نگاہِ رفوگر کی برہمی عاصم
تمام چاکِ دل و جاں پڑے ہیں سینے مجھے

محاذِ ہجر پہ ہم دونوں تندہی سے لڑے
سو ایک مارا گیا ایک مرنے والا ہے

کہیں ایسا نہ ہو دامن جلا لو
ہمارے آنسوؤں پر خاک ڈالو

منانا ہی ضروری ہے تو پھر تم
ہمیں سب سے خفا ہو کر منالو

بہت روئی ہوئی لگتی ہیں آنکھیں
مری خاطر ذرا کاجل لگالو

تہ و بالا ہوئی جاتی ہیں سانسیں
تم اپنے قرب کا کچھ جائزہ لو

کِسی پر پاؤں پڑ جائے نہ میرا
مرے آگے سے یہ چیزیں ہٹا لو

پڑے گا آئنہ خانہ پہ کیا فرق
چلو اک اور آئینہ لگا لو

بڑا اندھیرا ہے باہر نہ جاؤ
رہو گھر میں مرے گھر کے اُجالو

اکیلے پن سے خوف آتا ہے مجھ کو
کہاں ہو، اے مرے خوابو خیالو

بہت مایوس بیٹھا ہُوں مَیں تم سے
کبھی آکر مجھے حیرت میں ڈالو

وہ جو پُوچھیں تو مُسکرائیں ہم
حال رو رو کے کیا سُنائیں ہم

آس کی ڈور اور ہجر کی رات
کیسے کٹتی ہے کیا بتائیں ہم

سایہ دیکھیں کہ دُھوپ کچُھ تو کہو
پاس آئیں کہ دُور جائیں ہم

تُو بھی تنہا ہے مَیں بھی آوارہ
آ کہیں مِل کے گھر بنائیں ہم

کوئی اپنے سوا نہیں باقی
اور اب کِس کو آزمائیں ہم

غیر کا وصل، وصل ہی تو نہیں
ورنہ تجھ کو تو بھول جائیں ہم

دل پہ راب کرلیا پتھر
آنکھ تر ہو تو ڈوب جائیں ہم

گئی نہ دل کی تڑپ ترکِ آرزو سے بھی
عجیب پیاس ہے بُجھتی نہیں لہو سے بھی

اب ایک عہدِ مُدارات ہے عدُو سے بھی
ہدف بھی بننا ہے جینا ہے آبرو سے بھی

زباں بُریدہ بھی چاہے مجُھے مرا قاتل
کشید کرتا ہے نغمہ رگِ گلو سے بھی

خبر یہ تھی کہ سکوں کُو بہ کُو بحال ہُوا
مگر مِلا نہیں تحقیق و جستجو سے بھی

کِسی گلاب سے مہکاؤ اپنے آنگن کو
نہیں تو باز رہو شوقِ رنگ و بُو سے بھی

عبث اُٹھاتے ہو الزامِ مصلحت عاؔصم
طلب بھی رکھتے ہو انکار ہے سبُو سے بھی

آتے ہو مثلِ خواب مری خواب گاہ میں
مُجھ سے یہ اجتناب مری خواب گاہ میں

اے غیرتِ بہار یہ تصویر ہے تری
یا دستۂ گلُاب مری خواب گاہ میں

میرے یہ دوش و سینہ و بازُو ترے لیے
بستر ہیں بے حساب مری خواب گاہ میں

حدِّ افق نہ دیکھ یہ شامِ وصال دیکھ
ڈُوبے گا آفتاب مری خواب گاہ میں

پیتا رہا میں اُس کی نگاہوں سے رات بھر
رکھّی رہی شراب مری خواب گاہ میں

عاؔصم کوئی رہے نہ رہے، عمر بھر رہیں
آئینہ اور کتاب مری خواب گاہ میں

پھر کون دِیا لایا پھر کیسی شناسائی
سب شام سے پہلے کی باتیں ہیں مرے بھائی

حلقۂ بام میں روشن ہے دیارات گئے
اور شب خُون پہ مائل ہے ہَوا رات گئے

ماتمِ شہرِ نگاراں سے کہیں بہتر ہے
اور کچُھ دیر رَہو محوِ دُعا رات گئے

اور کچُھ دیر رہو صُبح کی خواہش میں شریک
اور کچُھ دُور چلو ساتھ ذرا رات گئے

اور کچُھ دیر رہو خلوتِ جاں میں رقصاں
اور کچُھ دیر چلو مثلِ صبَا رات گئے

مَیں اِسی شوق میں جاگا تھا کہ عاصمؔ مُجھ کو
لے کے نکلے گی کوئی تازہ نوَا رات گئے

یہ منظر سرِ شہرِ جاں ایک سا ہے
مکاں مُختلف ہیں دُھواں ایک سا ہے

یہ اُجڑے ہُوئے لوگ آباد ہوں گے
ترا وہم میرا گُماں ایک سا ہے

موج میں تھے تری آواز کے مارے ہُوئے لوگ
کِس کی سُنتے ہیں بھلا تیرے پُکارے ہُوئے لوگ

ایک ہی رنگ کے ملبوس پہن کر نِکلے
آئنہ خانۂ قاتل کے سنوارے ہُوئے لوگ

ظُلم ہی ہم کو بدل دے تو بدل دے شاید
حق بجانب ہیں یہ لوگوں پہ اُتارے ہُوئے لوگ

سنگ اِک ردِّ عمل تھا سرِ آغازِ جنوں
جب سمندر تھے مگر اب تو کنارے ہُوئے لوگ

وُہی خیمہ ہے وُہی، ہم ہیں وُہی شہر کی رسم
گھر بنا لیتے ہیں سیلاب گزُارے ہُوئے لوگ

نسل در نسل چلی ہے یہ کشاکش اب تو
جیت لائیں گے تجھے دیکھنا ہارے ہُوئے لوگ

منزلِ صبح بہت دُور نہیں ہے عاصمؔ
رشک کیا کیجیے اس پر کہ ستارے ہُوئے لوگ

کیے گئے مرے حصّے کہاں کہاں کے لیے
بدن زمیں کے لیے رُوح آسماں کے لیے

مَیں تیرے نام کی لذّت میں یہ بھی بُھول گیا
ہزار ذائقے ہوتے ہیں اِک زباں کے لیے

مَیں اپنے نام کی تختی پہ لِکھ نہیں سکتا
وہ دُکھ جو باپ نے جھیلے ہیں اِس مکاں کے لیے

ہر اِک لباس میں عُریاں دکھائی دیتی ہے
حیا بھی فرض نہیں ہے عروسِ جاں کے لیے

جو سخت جاں تھے بہت وہ بھی تھک گئے اب تو
کہیں پڑاؤ ضروری ہے کارواں کے لیے

اُڑان بھرنے سے پہلے یہ سوچ لو عاصم
زمین چھوڑنی پڑتی ہے آسماں کے لیے

دُھوپ میں اپنی طرف جیسے شجر کھینچتے ہیں
تنگ دستی میں کہاں صاحبِ زر کھینچتے ہیں

کچُھ مسائل ہیں کہ رکھتے ہیں مُجھے گھر سے پرے
کچُھ تقاضے ہیں کہ جو جانبِ در کھینچتے ہیں

بھیج کر تنہا مسافت پہ مُجھے گھر والے
اپنے مکتوب میں اب حدِ سفر کھینچتے ہیں

درد ہم گوشہ نشینوں کا کوئی کیا جانے
بر سرِ لوح و قلم رنجِ ہُنر کھینچتے ہیں

اُس کی آنکھوں میں بھی تاثیر ہے ایسی عاصم
ڈوبتی چیز کو جس طرح بھنور کھینچتے ہیں

یادوں کے گلاب کِھل رہے ہیں
خوشبو سے دماغ جل رہا ہے

تم ہو کہ یہ اوس پڑ رہی ہے
مَیں ہُوں کہ یہ باغ جل رہا ہے

غم کو کبھی راکھ کر سکے گی
جس شے سے ایاغ جل رہا ہے

ترے سوا یہ توقّع نہیں کسی سے مجھے
کرے جو غم بھی فراہم مری خوشی سے مجھے

تُو یاد آئے تو اے دوست یاد آتا ہے
کبھی تھا پیار بہت اپنی زندگی سے مجھے

ابھی تو راہ میں حائل ہے تیری بے خبری
پُکارتا ہے ترا جسم کیوں ابھی سے مجھے

تُو اب ملے تو بتاؤں کہ کیا ہُوا اُس شام
چراغ دُور نظر آئے روشنی سے مجھے

ہزار بام و دریچہ سے روشنی اُترے
تجھے نہ دیکھا تو پھر کیا تری گلی سے مجھے

مَیں مہر و ماہ کا محور سہی مگر یہ چراغ
بچا سکیں گے نہ اندوہِ تیرگی سے مجھے

عجیب شخص ہے غالبؔ کہ یُوں ملا عاصمؔ
مُعاملہ نہ رہا میرؔ و مصحفیؔ سے مجھے

بے رہروی نہیں تھی جیسا بھی چل رہا تھا
وہ تھا تو کاروبارِ دُنیا بھی چل رہا تھا

خُود ہم نے سمت بدلی ورنہ ہَوا کے رُخ پر
کشتی بھی جا رہی تھی دریا بھی چل رہا تھا

وہ یاد آ گیا تھا اور شام ہوتے ہوتے
ہم بھی رَواں دَواں تھے رستا بھی چل رہا تھا

گاہے بہ گاہے وہ بھی کرتا تھا یاد ہم کو
کچُھ زور اُس کے دل پر اپنا بھی چل رہا تھا

تشنہ لبی کے دن تھے وہ دن جُدائیوں کے
ہر چند دورِ جام و مینا بھی چل رہا تھا

اب مَیں ہُوں اور میری تنہائیاں سفر میں
جب تم تھے ساتھ میرے سایا بھی چل رہا تھا

دشتِ ہُنر میں اب تو افسوس کا سماں ہے
پہلے اِک آبلہ پا پیاسا بھی چل رہا تھا

گھر میں آکر بھی یہ حسرت ہے کہ گھر کو چلیے
وُہی آشوبِ مسافت ہے جدھر کو چلیے

قیمتِ آئنہ اِک سنگِ نظر بھی نہ رہی
جلد اُٹھیے خبرِ آئنہ گر کو چلیے

"بُوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل"
کِس کے ہمراہ یہاں سیر و سفر کو چلیے

چشم، خُوں بستہ ہُوئی ایک ہی منظر میں یہاں
ہائے کِس دل سے تماشائے دگر کو چلیے

کوئی دیوار پذیرائی کہیں ہے کہ نہیں
کب تک اے عشق سنبھالے ہُوئے سر کو چلیے

اب تو یہ شہر سرِ شام ہی سو جاتا ہے
کیوں اِدھر اور اُدھر جائیے گھر کو چلیے

سائبانوں کا تصوّر بھی ہُوا راکھ اب تو
دُھوپ ہی دُھوپ ہے صحرا میں کدھر کو چلیے

اک یہی منزلِ نایافت ہے عاصم باقی
از رہِ بے خبری اپنی خبر کو چلیے

دَر و دیوار بھی رُخصت ہُوئے ہائے گھر سے
کوئی جائے تو بہت دُور نہ جائے گھر سے

ٹُوٹ جائے گا کہیں اور چلے جانے سے
یہ جو دیوار کا رشتہ ہے پرائے گھر سے

جاگتا ہی نہیں کوئی کِسی بے خواب کے ساتھ
ایسی راتوں میں تو بہتر ہے سرائے گھر سے

مہ و خورشید بہت شور مچاتے ہیں مگر
نہیں جاتے تری آواز کے سائے گھر سے

میری تسکین اِسی میں ہے کہ تا عُمر مُجھے
کبھی صحرا کبھی دریا نظر آئے گھر سے

چاہے شورِ ستائش کا ہو
کچھ آوازیں کھل جاتی ہیں

کشتی کو ساحل دِکھلا کر
لہریں دُور نکل جاتی ہیں

برتا ہُوا ہے تیرے مزاج کرخت کا
دل میرا کیوں حریف نہ ہو سنگِ سخت کا

تُو نے کہا تو گھر سے نکل آئے ناگہاں
صحرا میں یُوں بھی کام نہ تھا ساز و رخت کا

شاخیں اُلجھ رہی ہیں سبھی اپنے آپ سے
کیا حال کر دیا ہے ہَوا نے درخت کا

جتنے بھی نرم خُو تھے سبھی سنگدل ہُوئے
مَیں دل سے معترف ہُوں ترے دورِ سخت کا

شہرِ سبا کو اپنی ہَوا لے گئی، ہمیں
تھا سب کو انتظار سُلیماں کے تخت کا

گاتا ہے گیت کون کِسی اور کے لیے
روتے ہیں سب ہی رونا یہاں اپنے بخت کا

دل عجب طرح کا زندانِ تمنّا ہے یہاں
روز اک تازہ گرفتار ضرور آتا ہے

میرا سایہ ترے آسیب سے بچ کر چلتا
چال کوئی مجھے آتی تو سراسر چلتا

گھر میں ہوتا نہ اگر زہرِ سفر کا تریاق
شام کے بعد میں اِک گام بھی کیوں کر چلتا

جانِ قربت غمِ دُوری تو گراں ہے لیکن
بیٹھ جاتا میں اگر گھر میں تو کیا گھر چلتا

مجھ کو رُخصت ہی نہ دی سیلِ ہَوا نے ورنہ
اے گُلِ جاں مَیں تجھے ساتھ ہی لے کر چلتا

مَیں بھی تشکیک سے گزرا ہُوں تیقّن کے لیے
آگ سے بچ کے بھلا کیسے سمندر چلتا

پاؤں جمتے نہیں اپنے تو اُکھڑ کر رہ جائیں
کاش اِس گھر میں کوئی صُورتِ صَرصَر چلتا

نِکل کر حلقۂ اہلِ اثر سے بھاگ جاؤں مَیں
کئی دِن سے یہ خواہش ہے کہ گھر سے بھاگ جاؤں مَیں

ذرا ہمت کرے یہ دل تو شاید دُوسرے پَل میں
چُھڑا کر جان دستِ چارہ گر سے بھاگ جاؤں مَیں

ابھی رستے میں ہیں کچھ جانے پہچانے ہُوئے چہرے
ہراساں ہو کے کیوں گردِ سفر سے بھاگ جاؤں مَیں

چلو یُوں ہی سہی اب کے زیادہ بارشیں ہوں گی
تو کیا اپنے شکستہ بام و دَر سے بھاگ جاؤں مَیں

چلو یُوں ہی سہی اب کے نشانے پر فقط ہُوں مَیں
تو کیا مُنہ پھیر کر اُن کی نظر سے بھاگ جاؤں مَیں

کہاں وہ آنکھ کہ اُس بام سے آگے بھی کچھ دیکھوں
کہاں وہ پاؤں کہ اُس رہگزُر سے بھاگ جاؤں مَیں

گھر ہم نے بنایا بھی تو اِک عُمر لگادی
انفاس کی ترتیب میں ساماں سے زیادہ

مِلے تو کاش مِرا ہاتھ تھام کر لے جائے
وہ اپنے گھر نہ سہی مُجھ کو میرے گھر لے جائے

دیا کروں گا یُونہی تیرے نام کی دستک
مرا نصیب مجھے لاکھ دَر بدَر لے جائے

بُتانِ شہر تمھارے لرزتے ہاتھوں میں
کوئی تو سنگ ہو ایسا میرا سر لے جائے

وہ آدمی ہو کہ خوشبو بہت ہی رُسوا ہے
ہَوائے شہر جسے اپنے دوش پر لے جائے

یہ فیصلے کی گھڑی ہے تو فیصلہ کرلو
کوئی ستوں کوئی دیوار کوئی در لے جائے

صحرا کی طرف شہر سے لائے گئے کچھ لوگ
عاشق بھی نہ تھے قیس بنائے گئے کچھ لوگ

کس جرم کی پاداش میں معلوم نہیں کیوں
بستی سے بہت دور بسائے گئے کچھ لوگ

لہریں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں چٹان میں
اِک ناؤ آ کے ٹُوٹ گئی درمیان میں

دستِ رقیب بارِ رقابت سے جُھک گیا
ترکش کے سارے تیر سجا کر کمان میں

دل دل کو آنکھ آنکھ کو پہچانتی نہیں
آباد ایک شہر ہو جیسے مکان میں

کانٹے کو بھی یہ حق ہے کہ سمجھے بزعمِ خود
مُجھ سا نہیں ہے کوئی بھی اِس خاکدان میں

یہ بھی تجھے گوارا نہیں اے، ہَوا کہ ہم
دل ہی ذرا جلائیں اندھیرے مکان میں

رشک و حسد کی بات الگ ہے مگر کبھی
ہم نے کِسی کو خوش نہیں دیکھا جہان میں

کشتی بچا تو لائے ہیں عاصم ہواؤں سے
پیوند سو طرح کے سہی بادبان میں

خواب یُوں چھوڑ کے بستر نہیں جانے دیتے
جیسے آئینے سنور کر نہیں جانے دیتے

کل مَیں گھر چھوڑ کے آجاؤں تو کھو جائیں گے
آج احباب مجھے گھر نہیں جانے دیتے

مَیں ترستا ہی رہا اُن کو کہ جو ملتے ہیں
اور پھر اگلے سفر پر نہیں جانے دیتے

کاٹ دی ڈور پتنگوں نے کئی جانوں کی
لوگ بچّوں کو چھتوں پر نہیں جانے دیتے

اُس محلّے کے عجب لوگ ہیں اُس کے در تک
آدمی کیا ہے کبوتر نہیں جانے دیتے

خُدا نا کردہ کسی بے ہُنر کے ہاتھ لگے
ہم آگ بیچ رہے ہیں دیا سلائی میں

پتہ اگر نہیں منزل کا معذرت کر لو
لیے لیے نہ پھرو شوقِ رہنمائی میں

راستے میں نہ آ شجر کی طرح
مل کہیں دوپہر میں گھر کی طرح

ہم اُسے دیکھنے کہاں جائیں
ساتھ رہتا ہو جو نظر کی طرح

لوگ دوڑے گھروں کی سمت آخر
شام آئی بُری خبر کی طرح

دُور افق پر ہے آندھیوں کا ہجوم
اور ہم بے خبر شجر کی طرح

وہ ہُوا ہے کہ اب تو بازُو بھی
ٹُوٹتے جا رہے ہیں پَر کی طرح

آنکھ تھی بند سیپ کے مانند
اشک پلکوں پہ تھے گہُر کی طرح

نہ ٹھیرا گیا حرفِ مطلب پہ عاصؔم
بہت موڑ آئے گئے گفتگو میں

لے اُڑا ہے نشّۂ رنگِ جہاں بارش کے بعد
مَیں زمیں دیکھوں کہ دیکھوں آسماں بارش کے بعد

سبزۂ نوخیز کا جوشِ نمُو تھا دیدنی
ٹُوٹ کر نکلا زمیں سے ناگہاں بارش کے بعد

جو مری آنکھوں میں تھا بارش سے پہلے بیقرار
اب وہ آنسو ڈھونڈنے جاؤں کہاں بارش کے بعد

کُشتۂ رنگینیِ موسم تو تھے پہلے ہی ہم
کھینچ لی قوسِ قزح نے بھی کماں بارش کے بعد

مُنجمد رستوں کو پگھلانے لگی سُورج کی آگ
چل پڑا پھر زندگی کا کارواں بارش کے بعد

شہرِ جاناں کی فضا ہو یا طبیعت عشق کی
آگ ہے بارش سے پہلے اور دُھواں بارش کے بعد

رو کے بھی وہ حال ہے جیسے ابھی رو دیں گے ہم
دیر تک رہتا ہے بارش کا گُماں بارش کے بعد

اپنے سوا نہیں ہے کوئی ماسوا کا رنگ
دیکھا ہے، ہم نے آگ جلا کر ہوا کا رنگ

ہر گوشۂ بساطِ چمن ہے لہو لہو !
دُھومیں مچا رہا ہے کسی کی انا کا رنگ

آئی جب اپنے شہر کی تصویر سامنے
آنکھوں کے آگے پھیل گیا کربلا کا رنگ

جمتی نہیں نگاہ کسی تیز چشم کی
پہنا ہے قاتلوں نے بھی کیسا بلا کا رنگ

یک رنگیِ حیات سے گھبرا نہ جائیں کیوں
جو آج غیر کا ہے وہی آشنا کا رنگ

پرواز کی ہے فکر کہ غم بال و پر کا ہے
عاصمؔ اُڑا اُڑا سا ہے خلقِ خدا کا رنگ

خُدا بچائے مرے شہرِ حُسن پرور کو
ہر ایک ہاتھ میں تیزاب کا پیالہ ہے

عدو کا ذکر نہیں دوستوں کا نام نہیں
زباں پہ آج کوئی حرفِ انتقام نہیں

در و دریچہ کے داغ و چراغ اپنی جگہ
مجھے جلا کے نہ گزری تو شام نہیں

چلو ٹھہر نہیں سکتے گزر تو سکتے ہو!
کہیں کہیں سے شکستہ ہے دل تمام نہیں

جسے پکارتے پھرتے ہیں کو بہ کو ہم لوگ
وہ ایک عہدِ تمنّا ہے صرف نام نہیں

یہ خاکدانِ تعلّق ہے پیش و پس میں نہ جا
حصولِ آتش و آب و ہَوا مدام نہیں

کئی بُجھے ہُوئے سینوں کو آگ ہے درکار
زباں پہ نام تمھارا برائے نام نہیں

کہیں ہے داغِ تمنّا کہیں نشانِ اُمید
اُفق اُفق ہے وُہی رنگِ آسمانِ اُمید

تمام دن نہ اُڑے شب میں کیا اُڑان بھریں
اُسی مُنڈیر پہ بیٹھے ہیں طائرانِ اُمید

کہیں قریب کوئی حادثہ گزر جائے
کہ اُٹھ کے مَیں بھی بڑھاؤں ذرا دُکانِ اُمید

نظر چُرائے ہُوئے مُنصفوں کی چالوں سے
بساطِ خاک پہ رقصاں ہیں رفتگانِ اُمید

نہ کوئی در نہ دریچہ نہ کوئی پاس پڑوس
عجیب طرح کا زنداں ہے یہ مکانِ اُمید

ہمی پہ ختم نہیں ہے یہ سلسلہ اے دل
قدم قدم پہ ملیں گے شکستگانِ اُمید

کہیں گزرتی ہے اس طرح زندگی عاصم
نہ کوئی جانِ تمنّا نہ کوئی جانِ اُمید

پرندے چُپ فضا سہمی ہُوئی ہے
یہاں کیسی بَلا آئی ہُوئی ہے

ہُوئی جو بات ہونی تھی کِسی دن
مگر لگتا ہے انہونی ہُوئی ہے

ابھی خاموش ہی رہنا ہے بہتر
خُدا سے گفتگو ٹھہری ہُوئی ہے

کوئی رہزن سہی آگے تو آئے
یہ خلقت راہ میں بیٹھی ہُوئی ہے

کسی ملاح کو کیا کام اس سے
دھنک دریا میں کیوں اُتری ہُوئی ہے

کناروں کا خُدا حافظ ہے عاصمؔ
سمندر کی ہَوا بدلی ہُوئی ہے

اب کے ہم روئیں تو دریا ہی بہا دیں شاید
یا پھر اس آگ کو کچھ اور ہوا دیں شاید

اہلِ تائید کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں پہ نہ جا
جانِ محفل تجھے محفل سے اُٹھا دیں شاید

ڈوب جانے کا بھی اِمکاں سہی، اُمّید تو ہے
یہ تھپیڑے ہی ہمیں پار لگا دیں شاید

اپنی آنکھوں کو اُجالو کہ سفیرانِ ہَوا
آج کی رات چراغوں کو بُجھا دیں شاید

لا کے چھوڑا ہے عجب موڑ پہ دُنیا نے ہمیں
یاد تجھ کو کریں اِتنا کہ بُھلا دیں شاید

ہو بھٹکنے کی تمنّا جسے، ہم سے پوچھے
وہ گلی اور وہ دہلیز دکھا دیں شاید

دل میں جو آئی ہے لب پر نہیں لانا عاؔصم
لوگ پاگل ہیں تجھے روگ لگا دیں شاید

بجانِ شہر کوئی آس پاس اب بھی ہے
سکوت اب بھی ہے باقی ہراس اب بھی ہے

جو آئینوں سے مرصّع ہے اُس مکاں کے لئے
ہر ایک سنگ سراپا سپاس اب بھی ہے

کوئی تو ہے جو کہیں رہ گیا پہنچ نہ سکا
کوئی تو آئے کہ محفل اُداس اب بھی ہے

ہزار چارہ گروں تک مری رسائی ہو
تمہارا درد تو اس دل کو راس اب بھی ہے

ہزار اس کو کوئی ننگِ اعتبار کہے
مگر یہ بات کہ لوگوں کو آس اب بھی ہے

لہو کے داغ لہو کے سوا نہیں مِٹتے
اِسی لئے تو بدن پر لباس اب بھی ہے

مَیں پی چُکا ہوں کئی جام زہر سے لبریز
حذر کرو مرے ہونٹوں پہ پیاس اب بھی ہے

کہیں ملیں گے تو بچھڑیں گے دوستوں کی طرح
یہ وہم اب بھی ہے ہم کو قیاس اب بھی ہے

مگر یہ لوگ بھی میرے کریں خون بھی میرا
مجھے تو تیری محبّت کا پاس اب بھی ہے

عدو بھی لگتے ہیں ناراض دوست بھی عاصم
اس آئینے میں کوئی التباس اب بھی ہے

شام کے آنکھ چُراتے ہُوئے منظر کے قریب
ایک خورشید نکلتا ہے مرے گھر کے قریب

مُجھ کو بھگوان سے کیا کام کہ مَیں جاتا ہُوں
ایک داسی سے مُلاقات کو مندر کے قریب

رات اِک خواب بکھر جاتا ہے اِن آنکھوں میں
صُبح اِک پُھول سجا لیتا ہُوں بستر کے قریب

وہ کہ صحرا سے جنھیں دُور کی نسبت بھی نہیں
گھر بنانے چلے آئے ہیں مرے گھر کے قریب

آج بھی میرے عزائم ہیں چٹانوں کی مثال
مَیں نے اِک عُمر گزاری ہے سمندر کے قریب

آؤ ہمسائے کو جلنے سے بچالیں عاصم
دیکھو اب آگ پہنچنے کو ہے اِس گھر کے قریب

عدُو تھے حلقۂ یاراں میں مثِل مُوئے سپید
کہ ایک ہم نے نکالا تھا دس نِکل آئے

اپنی تقدیر سے لڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں
لوگ مِل مِل کے بچھڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

ایسے عالم میں کوئی ساتھ چلے گا کب تک
پاؤں بے سمت ہی پڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

آئنے ٹوٹیں تو ہم جوڑ دیا کرتے تھے
عکس اب اپنے بگڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

کوئی ایفا نہیں کرتا کہ مِلے آزادی
لوگ وعدوں میں جکڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

ہر گُلِ تازہ سے آتی ہے تمہاری خوشبو
زخم سِل سِل کے اُدھڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

کہیئے تقدیر کہ تدبیر کو روئیں عاصم
کام بن بن کے بگڑتے ہیں جہاں جاتے ہیں

اتنی شہرت خدا کِسی کو نہ دے
اب کوئی نام ہی نہیں لیتا

مَیں کون ہوں کیا ہوں یہ بتانا نہیں پڑتا
بن جاتا ہے ماحول بنانا نہیں پڑتا

اب خود وہ سرِ شام پلٹ آتا ہے گھر کو
صحرا سے اُسے ڈھونڈ کے لانا نہیں پڑتا

انفاس کو سینے سے لگا لیتی ہے خوشبو
پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھانا نہیں پڑتا

اب خود وہ مِرے حال پہ رو دیتا ہے اکثر
پہلے کی طرح رو کے رُلانا نہیں پڑتا

چُبھ جائے جہاں خار، صدا دے جہاں خوشبو
رستے میں کوئی اور ٹھکانا نہیں پڑتا

ہر طرح کے موسم یہیں مل جاتے ہیں عاصمؔ
اب شہر سے باہر مجھے جانا نہیں پڑتا

دَر سے کبھی آئے کبھی دیوار سے آئے
کچُھ سانحے گھر میں بڑی رفتار سے آئے

تنہائی کا نشّہ تھا اُترنے کو سرِ شام
ہم خود کو سنبھالے ہُوئے بازار سے آئے

ہم اہلِ جزیرہ ہیں، ہمیں کیا کہ یہ طوفاں
اِس پار سے آئے ہیں کہ اُس پار سے آئے

پڑھ پڑھ کے سُناتا ہُوں تو مضموں نہیں کھُلتا
مکتُوب یہ کیسے نگہِ یار سے آئے

بس اپنی طبیعت ہی گوارا نہیں کرتی
رستے تو بہت پاؤں میں، ہموار سے آئے

چلیے تو اتنی بھیڑ کہ رستا نہیں کوئی
سوچیں تو جیسے شہر میں بستا نہیں کوئی

شعلے کا نام دُوں تو لپکتے ہیں سب کے سب
ابرِ کرم کہوں تو برستا نہیں کوئی

صُورتِ موجۂ سرِ ساحل
کِس لیے بے قرار ہے اے دل

کون آئے گا کون بتلائے
کیوں سجائی گئی ہے یہ محفل

کیا بتاؤں کہ سانس کا عالم
ایک حق ہے تو دُوسرا باطِل

کیا کروں مَیں کہ خشک ہے حلقوم
اور عُجلت میں ہے مرا قاتل

ساربان کیا کرے کہاں جائے
پُشتِ ناقہ سے گر پڑا محمل

لوگ یوں کشتیوں میں بیٹھے ہیں
تنگ ہو جیسے حلقۂ ساحل

جادۂ تمنّا سے اپنی اپنی حیرت میں
لوگ جا نکلتے ہیں ریگ زارِ حسرت میں

ایک پَل کی فرُصت تھی وہ بھی سوچتے گزُری
کوئی کیا کرے آخر ایک پَل کی فرُصت میں

طاق میں دیا ہو یا آنکھ میں کوئی آنسو
سب سُلگتے رہتے ہیں اپنی اپنی خلوت میں

دشت میں ہو یا گھر میں گونجتا ہے سنّاٹا
حرفِ زیرِ لب کی بھی تاب ہے سماعت میں

اب تو کر گزرنا ہے یعنی جی کے مرنا ہے
کیا بُرا ہے کیا اچھا دیکھ لیں گے فرصت میں

جہاں اک بُوند کر سکتی ہو سیراب
وہاں بیٹھے ہُوئے دریا نہ سوچو

درا‌ڑیں پڑ گئیں چہرے پہ کتنی
کہا تو تھا تمھیں اتنا نہ سوچو

بند ہیں، ہونٹ چشم وا کیوں ہے
تیرا چہرہ سوالیہ کیوں ہے

ایک ہی شخص سے ہے نسبت کیا
حال لوگوں کا ایک سا کیوں ہے

شہر در شہر ہو تو بات بنے
ایک ہی گھر میں رَت جگا کیوں ہے

زخم اپنوں کے کیوں دکھائے تھے
رنج غیروں کی بات کا کیوں ہے

اِس قدر دل شکستگی کے بعد
مُجھ میں جینے کا حوصلہ کیوں ہے

مہرِ و ماہ و نجوم سے آخر
آدمی کا مُقابلہ کیوں ہے

موت سے کیوں لرز رہا ہے وجود
زندگی میرا مسئلہ کیوں ہے

کُوئے جاناں کے رہنے والو کہو!
جو غزل تھی وہ مرثیہ کیوں ہے

گھر میں غارت گری پہ آمادہ
کُوچۂ غیر کی ہوا کیوں ہے

بہت چُپ چُپ ہیں رُونا چاہتے ہیں
ترا دامن بِھگونا چاہتے ہیں

بہت امکان ہے بارش کا اور ہم
کُھلے آنگن میں سونا چاہتے ہیں

ضرورت ہے تمُھارے آنسوؤں کی
ہم اپنے زخم دھونا چاہتے ہیں

کوئی دامن تو لہرائے فضا میں
سِتارے خاک ہونا چاہتے ہیں

دریچے بند ہی رہنے دو عاصمؔ
ذرا ہم کُھل کے رونا چاہتے ہیں

جب آفتاب مرے سر پہ آگیا تو کُھلا
کمال رکھتا ہے سایہ گُریز پائی میں

حُباب کے جو برابر کبھی حبابؔ آیا
کُھلا کہ جان بھی جاتی ہے آشنائی میں

دِلوں کے رَبط کبھی یُوں بھی ٹُوٹ جاتے ہیں
کہ جیسے لکھتے ہُوئے لفظ چھُوٹ جاتے ہیں

مرے خُدا یہ مسافت دُکان سے گھر تک
کئی کھلونے یُونہی ٹُوٹ پھُوٹ جاتے ہیں

یہ سانحہ ہے مگر اِتنی سوگواری کیا
تعلّقات تو بنتے ہیں ٹُوٹ جاتے ہیں

جہاں شجر بھی ہوں دیوار و در بھی ہوں حائل
وہ راستے تو مُسافر کو لُوٹ جاتے ہیں

یہ تیرا شہر ہے عاصمؔ کہ دشتِ گمشدگی
کنارے ہاتھ میں آتے ہیں چھوٹ جاتے ہیں

کِس کو خبر تھی ایسی بھی اِک رات آئے گی
دَریا کے ساتھ شہر میں برسات آئے گی

چراغوں کی وحشت بڑھی جا رہی ہے
ہوا تیز ہوتی چلی جا رہی ہے

یہ کون آگیا ہے صفِ رنگ و بُو میں
کہ فصلِ محبّت جلی جا رہی ہے

وہ یُوں بات کرتے ہیں ہم سے کہ جیسے
کِسی اور سے بات کی جا رہی ہے

کِسی شاخ کو آگ دینا ہے گویا
ہر اک شاخ کو آگ دی جا رہی ہے

بلا شہر کی کھا گئی کتنے صحرا
سمندر کی رنگت اُڑی جا رہی ہے

خلوص و محبّت سے دامن چھُڑا کے
نہ جانے کہاں زندگی جا رہی ہے

ابھی وقت ہے کوئی رستہ نکالو
ابھی حبس میں سانس لی جا رہی ہے

ابھی اصل قصّہ تو باقی ہے عاصم
ابھی سے زباں سُوکھتی جا رہی ہے

اِسی دُکھ میں نہ جائیں رائگاں ہم
نہ ہونے کے برابر ہیں یہاں ہم

پڑوسی تک نہیں واقف ہمارا
کہاں اِس شہر کی وُسعت کہاں ہم

اُسے جب دیکھتے ہیں، دیکھتے ہیں
کئی بنتے بگڑتے نقشِ جاں ہم

خُدا جانے کہاں سے آ گئے ہیں!
زمین و آسماں کے درمیاں ہم

تصادم آخری رستہ ہے عاصم
جلا بیٹھے ہیں ساری کشتیاں ہم

شروعِ عشق میں سمجھے تھے ہم بھی
فراغت مل گئی کارِ جہاں سے

سرِ وجود حجابِ عدم اُٹھاتے ہیں
ہم اپنے ہاتھ کٹا کر عَلَم اُٹھاتے ہیں

کئی دنوں سے عجب حال ہے محبّت میں
نہ دل پہ زخم نہ مژگاں پہ نم اُٹھاتے ہیں

سُخنوری میں خود آرا ہیں خوشبوؤں کی طرح
غلط کہ مشورہ کر کے قدم اُٹھاتے ہیں

کھُلا یہ راز کہ اہلِ نیاز میرے خلاف
قدم اُٹھاتے ہیں جو بھی بہم اُٹھاتے ہیں

اُسے ہم اتنا سُبک مایہ کیوں سمجھتے ہیں
کہ بات بات پہ اُس کی قسم اُٹھاتے ہیں

کسی دیوار سے سَر پھوڑ لے گا
یہ پاگل شہر کا عادی نہیں ہے

کوئی چراغ بھی مدّھم نہیں کیا ہم نے
ہَوا کی زد پہ رہے رَم نہیں کیا ہم نے

ہزار راتیں گزُاری ہیں جاگتے سوتے
سفر کا فیصلہ یک دم نہیں کیا ہم نے

دیارِ عشق میں گمُنام کون رہتا ہے
کمال یہ بھی مگر کم نہیں کیا ہم نے

ہزار لوگ مِلے زندگی کی راہوں میں
کِسی کو تجُھ پہ مُقدّم نہیں کیا ہم نے

نگاہِ زخم رَساں دیکھ ایک بار تو دیکھ
کِسی نگاہ کو مرہم نہیں کیا ہم نے

تہوں میں دل کی خزانہ تھا درد کا لیکن
بکھر گیا تو فراہم نہیں کیا ہم نے

حُسن کو آئنہ کرے کوئی
کِس طرف چشم وا کرے کوئی

کسی آزارِ امکانی میں ہوں مَیں
تعجب کیا جو حیرانی میں ہوں مَیں

سرِ آئینہ از روئے تماشا
بقدرِ تشنگی پانی میں ہوں مَیں

کسی اُڑتی ہوئی شے سے زیادہ
تجھے کھو کر پریشانی میں ہوں مَیں

چراغِ خانۂ ہجرت ہوں گویا
ہواؤں کی نگہبانی میں ہوں مَیں

بہت کج ہے بساطِ عُمر پھر بھی
مُسلسل دست افشانی میں ہوں مَیں

بہت دُشواریاں پیش آ رہی ہیں
عبث سعیِ تن آسانی میں ہُوں مَیں

خُمارِ اوّلینِ ذات ٹُوٹا!
سو اَب کیفیّتِ ثانی میں ہُوں مَیں

اُسی کے ساتھ آبادی میں تھا مَیں
اُسی کے ساتھ ویرانی میں ہُوں مَیں

سمندر سے مجھے کیا خوف عاصم
ازل سے موج گردانی میں ہُوں مَیں

سے گزر رہی ہے۔ مثبت تخلیقی تنہائی اور منفی غیر تخلیقی تنہائی میں وہی فرق ہے جو مظلوم اور ظالم انسان میں فرق ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ جو انسان ــــــ اور محض مادّی انسان میں فرق ہے اور آگے بڑھ کر ہم اسے بحریہ یا دصالیہ تنہائی کا فرق بھی کہہ سکتے ہیں محض ظاہری ہیئت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے کیونکہ اس میں بڑی چالاکیاں اور عیاریاں پنہاں ہوتی ہیں انسانی محبت میں پگھلے ہوئے دل اور بکھلی ہوئی روحوں کے چہروں پر اُنکے باطن کا نور الگ دکھائی دیتا ہے اُن کی قوتِ جاذبہ ہی اور ہوتی ہے غرض کہ پاگل کی تنہائی اور ہے اور مجذوب کی تنہائی کچھ اور۔ مگر یہاں کے کچھ نقادوں نے ان کیفیتوں میں فرق کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایسے نقادوں کے دھوکے میں آنے والے قاری کے لئے حقیقی ادب کی تلاش ایک کارِ مشکل ہو گیا ہے۔ لیاقت علی عاصم کہیں کہیں اپنی بنیادی اور حقیقی رو سے بظاہر بچھڑا ہوا اور بھٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر میں اس آشوب اور اضطراب کی حالت کو بھی آنگن میں سمندر کی ایک وحشت سے تعبیر کرتا ہوں آخر کھیت کے لئے کھاد ایک بنیادی ضرورت ہے۔

مجھے اس بات کا دُکھ ہے کہ میں لیاقت علی عاصم کو پہلے اس طرح کیوں نہیں جان سکا جیسا کہ وہ ہے شاید اس میں کچھ میری بے توجہی ہے اور کچھ اُن کی لاپرواہی کہ اُنہوں نے مجھے کم سنایا اور وہ نہیں سُنایا جو مجھے ہلانے کے قابل تھا اب پیارے شاعر برادرم حسنین جعفری نے اصرار سے آگے بڑھ کر ضد کی کہ میں لیاقت علی عاصم کا منتخب کلام بالاستعاب دیکھوں پھر چاہوں تو اُسے رد کر دوں اور چاہوں تو اُسے سینے سے لگا لوں۔ میری ندامت اپنی جگہ مگر اُس خوشی کا اندازہ لگائیے جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر کی دریافت میں ملتی ہے لیاقت علی عاصم نے غزل میں بڑھت کی ہو یا نہ کی ہو، زندگی کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ضرور دیا ہے اور سمندر کے کنارے گزاری ہوئی ایک عمر کے آشوب حسن اور حیرت کو ایک ایسے شعری سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ انہیں آنگن میں سمندر کے شاعر کے علاوہ کچھ اور کہا بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ان دو استعاروں کی نئی تہذیبی معنویت اُن کے لئے قبولِ عام کے دروازے بھی کھولے گی۔
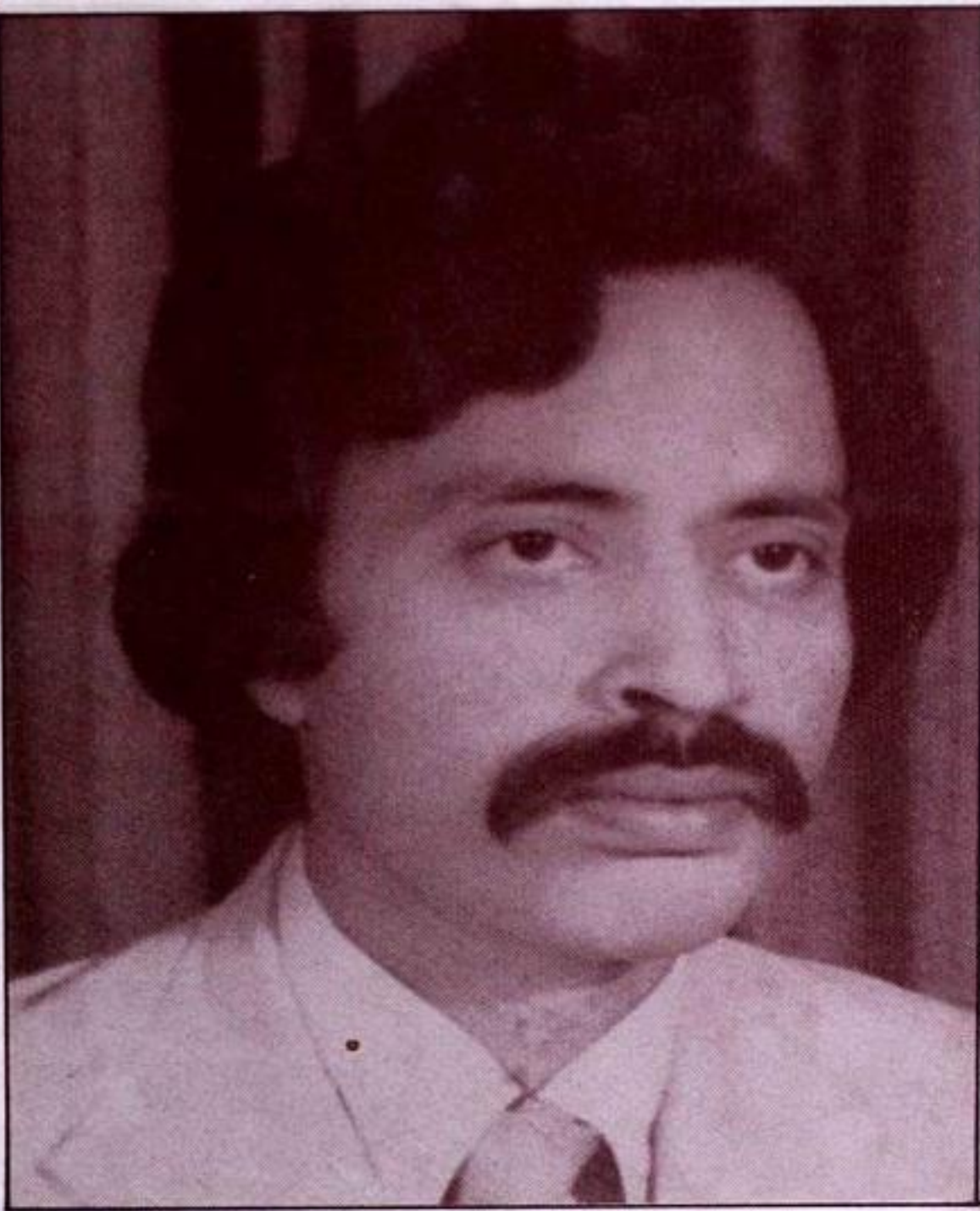
نام ـــــــ لیاقت علی عاصم

ولدیت ـــــــ حاجی علی رشر گاؤں کر

پیدائش ـــــــ ۱۴؍اگست ۱۹۵۱ء

مقام ـــــــ منوڑا۔ کراچی

تعلیم ـــــــ ایم اے اُردو (ادب)
۱۹۷۶ء جامعہ کراچی

ملازمت ـــــــ نائب مدیر
اُردو لغت بورڈ، کراچی

سرورق۔ جمیل نقش